اکادمی ادبیات پاکستان

8

سید امتیاز علی تاج (شخصیت اور فن)

تالیف، ڈاکٹر گوہر نوشاہی

پاکستانی ادب کے معمار

سیّد امتیاز علی تاج

(شخصیت اور فن)

تالیف: ڈاکٹر گوہر نوشاہی

تدوین: ڈاکٹر صدّیق شبلی

اکادمی ادبیات پاکستان ○ اسلام آباد

نگران اعلیٰ ______ سید آفتاب احمد شاہ

نگران ______ خالد اقبال یاسر

اہتمام طباعت ______ حمید قیصر

سرورق ______ سیف اللہ خالد

اشاعت اوّل ______ سنہ ۱۹۹۹ء

تعداد ______ ایک ہزار

مطبع ______ پوسٹ آفس فاؤنڈیشن پریس اسلام آباد

ناشر ______ اکادمی ادبیات پاکستان
سیکٹر ایچ ۸/۱، اسلام آباد

قیمت ______ -/۴۰ روپے
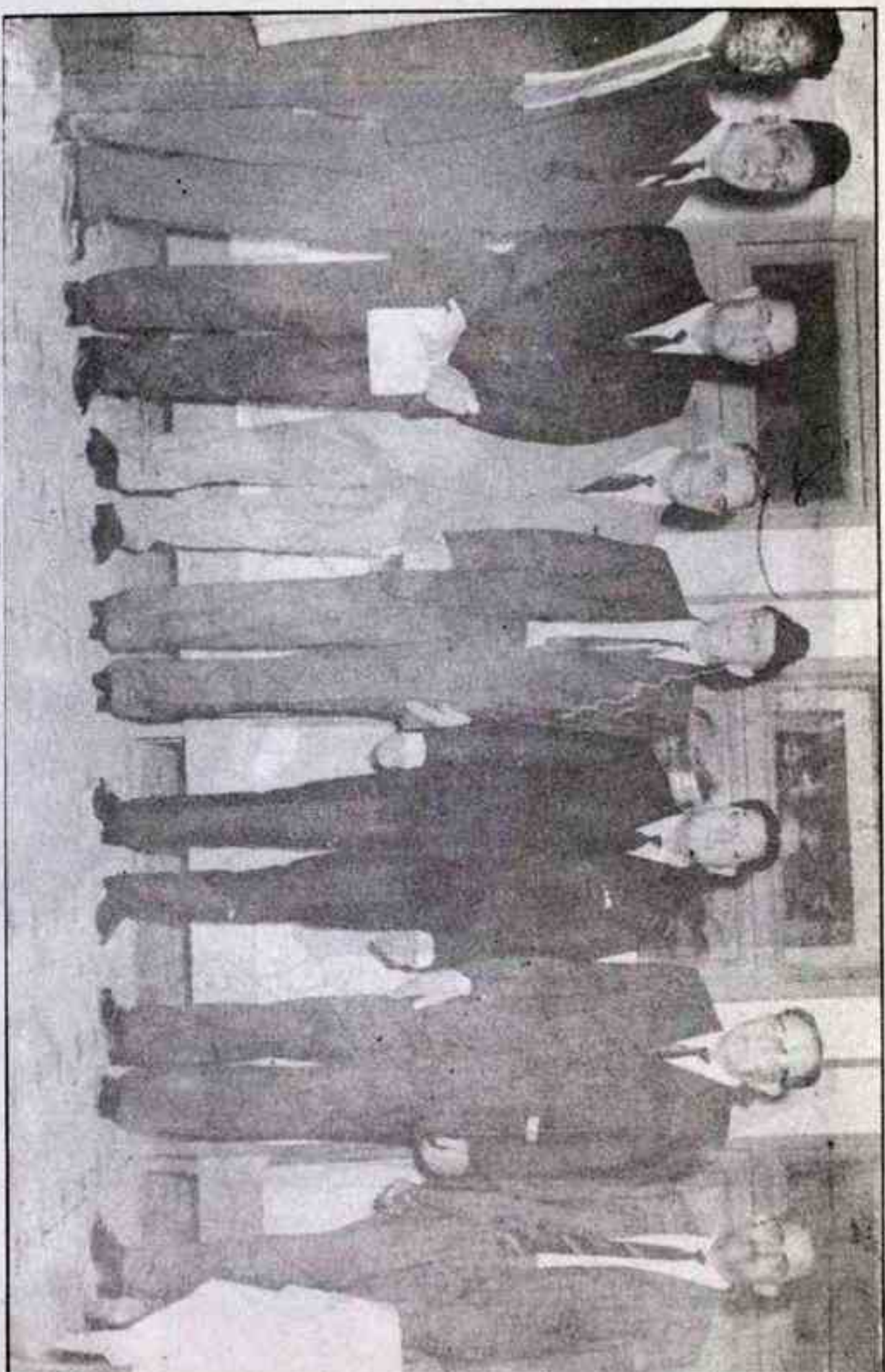
سید امتیاز علی تاج

ڈاکٹر گوہر نوشاہی، سید امتیاز علی تاج، جسٹس عطاء اللہ سجاد، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، مجلس ترقی ادب لاہور کی ایک تقریب (۲۴ر اکتوبر ۱۹۶۸ء)

فہرست مطالب

سانحہ وفات :۔

یادگار :۔

کتابیات :۔

پیش نامہ

"پاکستانی ادب کے معمار" اکادمی کا تازہ ترین ادبی و تحقیقی منصوبہ ہے۔ ادب کے معمار کی تعریف کے سلسلے میں اکادمی کو الجھن کا سامنا ہے۔ پاکستانی ادب نے ایک سے ایک ادبی نابغہ پیدا کیا ہے۔ ہر کسی نے اپنی اپنی صلاحیتوں اور میلان طبع کے مطابق پاکستانی ادب کے اس پر شکوہ ایوان کی تعمیر میں حصہ لیا ہے۔ اکادمی ایسے تمام مقتدر، ممتاز اور رجحان ساز ادیبوں کی ادبی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی کہکشاں ہے کہ جس کا ہر ذرہ اپنی جگہ آفتاب ہے۔

اکادمی ایسے تمام نامور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کے بارے میں کتابیں شائع کرنا چاہتی ہے۔ ایسی کتاب مونوگراف سے زیادہ اور تحقیقی مقالے سے کچھ کم ضخامت کی حامل ہوگی۔ ہماری کوشش ہے کہ ان کتابوں کی ضخامت، معیار اور مندرجات یکساں ہوں۔

معماران ادب کی تعریف کا مسئلہ اپنی جگہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان شخصیات کی ترجیحاتی فہرست مرتب کرنا بھی اتنا آسان نہیں۔ اس کتابی سلسلے کی آئندہ کتب کی اشاعت کیلئے ایک ترجیحاتی فہرست مرتب کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ

اکادمی کے مالی وسائل اتنی تعداد میں ساری کتابیں ایک ساتھ شائع کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس ترجیحاتی فہرست کے مطابق اس منصوبے کے تحت کتب کی اشاعت جاری رہے گی۔

ان معاملات میں آپ کو شریک کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اکادمی اور متعلقہ ادیبوں کے درمیان باہمی اعتماد کی فضا قائم رہے اور اکادمی کو اس منصوبے کا آپ کی رہنمائی میں از سرِ نو جائزہ لینے کیلئے وقت مل جائے گا۔

یہ بہرحال ایک اہم منصوبہ ہے اور اس کے جاری رہنے سے وہ مقاصد پورے ہوں گے جس کیلئے اکادمی قائم کی گئی تھی۔

اس منصوبے کے تحت جو کتابیں پہلے ہی طباعت کے مراحل سے گزر رہی تھیں ان میں سے ایک کتاب آپ کے ذوقِ مطالعہ کی نذر ہے۔

خالد اقبال یاسر

بقلم خود

سید امتیاز علی تاج کا نام اردو ادب میں محتاج تعارف نہیں۔ ان کی ادبی خدمات کی لا تعداد جہتیں ہیں۔ ان تمام جہات کا احاطہ صفحات کی قید میں محصور کسی مختصر کتاب میں کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ مجھے تاج صاحب کے ساتھ کئی سال بطور ہمکار کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کی شخصیت اور فکر و فن پر میرے پاس اس قدر معلومات ہیں کہ زیر نظر کتاب کے لیے ان سے انتخاب میرے لیے ایک امتحان سے کم نہ تھا۔ تاج صاحب نے اپنی زندگی میں ہی مجھ سے اپنی ادبی خدمات کے بارے میں تحریریں لکھوائی تھیں جن میں سے ایک زیر نظر کتاب میں موجود ہے۔ ان کی یہ خواہش بھی تھی کہ میں ان کی تمام تحریروں سے اعلی پایے کے مقالات منتخب کر کے "ترتیب دوں۔ افسوس کہ میں یہ کام ان کی زندگی میں انجام نہ دے سکا۔

سید امتیاز علی تاج کی ادبی فتوحات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ انھیں یک جا کرنے کے لیے بہت وقت درکار ہے۔ یہ کام کسی ایک شخص کا نہیں، نوجوان ادیبوں کو اس طرف توجہ دینی چاہیے۔

زیر نظر کتاب میں "مطالعہ تاج" کے لیے ایک مکمل اور بھرپور خاکہ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی جو تاج صاحب کے

سوانحی اور ادبی موضوعات پر کام کرنے والوں کے لیے راہنما بھی ہوں گی اور باعث بھی۔

اکادمی ادبیات کے صدرنشین، ڈائریکٹر جنرل اور کارپرداز ان سپاس و ستائش کے مستحق ہیں کہ ان کی کوششوں سے ایک ایسے منصوبے کا اجراء ہوا ہے جو آگے چل کر تاریخ ادبیات پاکستان کا ایک قابل قدر حصہ قرار پائے گا۔

مقتدرہ قومی زبان، پاکستان — ڈاکٹر گوہر نوشاہی
اسلام آباد — جولائی ۱۹۹۹ء

خاندانی پس منظر

امتیاز علی نام، سید خاندان اور تاج والدین کی طرف سے دیا ہوا اچھوتا نام تھا جو بچوں کو پیار سے عموماً گھروں میں دیا جاتا ہے۔ سوانحی تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نام ان کی والدہ کی پسند کا تھا۔

خاندانی شجرہ امام ہشتم حضرت علی بن موسیٰ تک پہنچتا ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ عرب سے بخارا میں قیام پزیر رہے جن کی اولاد اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں نقل مکانی کر کے برصغیر میں آگئی اور پنجاب میں انبالے کے علاقے جگادھری کو اپنا مسکن بنایا۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے ایک بزرگ سید ہاشم علی جگادھری کو خیر باد کہہ کر سہارنپور آگئے۔ سید قاسم علی کے بھانجے میر ستار علی بہادر گڑھ کے نواب کے یہاں مدار المہام تھے۔ سید ستار علی کے فرزند میر سید ذوالفقار علی، عربی، فارسی کے جید عالم اور دہلی کالج میں مولوی امام بخش صہبائی کے شاگردوں میں سے تھے۔ تعلیم مکمل کر کے شملہ میں انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے لیکن تعلیم کے شعبے کو ترک کر کے شعبہ انتظامیہ میں تحصیل داری کا عہدہ اپنالیا اور ترقی کرتے ہوئے اکسٹرا اکمشنر کے منصب تک جا پہنچے۔ سید امتیاز علی تاج کے والد شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی انہی میر سید ذوالفقار علی کے بیٹے تھے۔

والدِ گرامی:

شمس لعلماء مولوی سید ممتاز علی ۲۷ ستمبر ۱۸۶۰ء کو عید میلادالنبی کے روز پیدا ہوئے۔ تعلیم کے مختلف مراحل دیوبند، راولپنڈی، سرسہ، فیروزپور اور لاہور میں طے ہوئے۔ آپ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے شاگرد اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کے ہم درس تھے۔ سرسید احمد خاں، مولانا الطاف حسین حالی، شمس العلما شبلی نعمانی، مولوی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ سے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ ادب و انشاء میں مولوی محمد حسین آزاد کو اپنا اُستاد مانتے تھے اور اُن کا بے حد احترام کرتے تھے۔

سید ممتاز علی نے ۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۴ء تک گورنمنٹ ہائی سکول اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے دوران مشنری مبلغین کے زیر اثر اسلام کے بارے میں کچھ شبہات پیدا ہوئے جنھیں سرسید نے اپنے تدبر اور ژوف نگاہی سے دور کر دیا۔

ایف۔اے پاس کرنے کے بعد بی۔اے کے امتحان میں ناکام ہوئے اور ۱۸۸۴ء میں پنجاب چیف کورٹ میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۹۱ء میں علالت کے سبب ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں۔

سید ممتاز علی نہایت جوان صالح، ہونہار، ہوشیار، مودب اور لائق شخص تھے اس لیے سرسید ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور ان کو بے حد عزیز رکھتے اور ان کی بہبودی اور ترقی میں نہایت درجہ کوشش اور سعی کرتے رہتے تھے۔ ۱۸۸۴ء میں جب سید ممتاز علی نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے کا امتحان دیا اور کامیاب نہ ہو سکے، اسی وقت سے سرسید برابر اس فکر میں لگے

رہے کہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح سید ممتاز علی کو کوئی بہت مناسب اور موزوں لازمت مل جائے۔ اپنی عادت کے بر خلاف سر سید نے کئی جگہ ان کی سفارش کی۔ حیدر آباد دکن بھی متعدد مرتبہ لکھا مگر یہ عجیب بات ہے کہ سر سید کو اس معاملے میں پوری کوشش کے باوجود کامیابی نہیں ہوئی اور سید ممتاز علی کو کوئی معقول نوکری نہ مل سکی۔ یہ بھی شاید اچھا ہی ہوا کیونکہ قدرت کو ان سے جو کام لینا تھا، وہ ہرگز ظہور پذیر نہ ہوتا اگر سید ممتاز علی ملازمت کے جھنجھٹ میں پھنس جاتے۔

بی۔اے میں فیل ہونے کے بعد اُنھوں نے دوبارہ امتحان دینے اور کالج میں پڑھنے کا خیال چھوڑ دیا اور اسی سال یعنی ۱۸۸۴ء میں پنجاب چیف کورٹ لاہور میں بہ حیثیت مترجم ملازم ہو گئے۔ مگر یہ ملازمت اُن کی دل چسپی کی نہیں تھی اس لیے اس میں اُن کا جی نہ لگا اور اُس سے بہت دل برداشتہ رہے۔ اتفاقاً ۱۸۹۱ء میں بہت سخت بیمار ہو گئے اور اُن کو بہت بڑا بہانہ اس امر کا ہاتھ آگیا کہ یہ ملازمت کسی طرح بھی میرے حسب حال نہیں کیونکہ محنت بہت زیادہ اور تنخواہ بہت کم ہے اسی لیے صحت پر نہایت ناگوار اثر پڑا ہے۔ یہ بہانہ بہت کافی اور معقول تھا اس لیے ملازمت سے استعفا دے دیا۔

(صحیفہ تاج نمبر)

۱۸۸۸ء میں مولوی سید ممتاز علی ارشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے اہلیہ کا نام حمیدہ بیگم تھا۔ محترمہ حمیدہ بیگم کے والد مولوی حاجی معراج الدین نہایت سادہ طبیعت تھے۔ لاہور کے رہنے والے لیکن گوالیار میں محکمہ بندوبست میں ملازم تھے۔ اردو زبان میں شعر بھی کہتے تھے۔ محترمہ حمیدہ بیگم سے مولوی ممتاز علی کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹی سیدہ وحیدہ بیگم اور ایک بیٹا سید حمید علی عطا کیے۔ سیدہ وحیدہ بیگم کی شادی مراد آباد کے سر محمد یعقوب سے ہوئی تھی اور مولوی ممتاز علی کی زندگی ہی میں ۱۹۱۷ء میں ان کا انتقال

ہو گیا تھا۔

محترمہ حمیدہ بیگم تپ دق میں مبتلا ہو کر ۱۸۹۵ء کو انتقال کر گئیں۔ اس وقت مولوی سید ممتاز علی کے دونوں بچے بہت کم سن تھے۔ چنانچہ انھیں ازسر نو گھر آباد کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ۱۸۹۷ء میں مولوی صاحب کا نکاح ثانی سر سید احمد خاں کے دوست اور اپنے وقت کے روشن فکر صاحب علم اور ماہر تعلیم مولوی سید احمد شفیع کی صاحبزادی سیدہ محمدی بیگم سے ہوا جن کی عمر نکاح کے وقت صرف ۱۹ برس تھی۔

سیدہ محمدی بیگم کے مزاج اور علمی استعداد سے آگاہی کے بعد سید ممتاز علی نے فیصلہ کیا کہ خواتین کی ذہنی اور فکری بیداری کا جو خواب وہ عرصہ دراز سے دیکھ رہے تھے اس کی تعبیر کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے شادی کے سات آٹھ ماہ بعد ہی خواتین کے لیے ایک ہفت روزہ تہذیب نسواں کے نام سے جاری کر دیا۔ جس کی ادارت سیدہ محمدی بیگم کے سپرد ہوئی۔ تہذیب نسواں کا پہلا شمارہ یکم جولائی ۱۸۹۸ء کو منظر عام پر آیا اس کے اجراء سے پہلے سید ممتاز علی نے سر سید احمد خاں سے مشورہ کیا۔ اُنھوں نے پہلے تو اس خیال کی شدید مخالفت کی اور پھر اس کا نام تہذیبِ النسواں تجویز کیا۔

سید ممتاز علی نے اس مقصد کے لیے ۱۸۹۸ء کے آغاز میں ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا جس کا نام دارالاشاعت پنجاب رکھا۔ سید صاحب نے اس ادارے سے پھول اور کہکشاں بھی جاری کیے اور ان کے علاوہ اپنی تصانیف کا ایک ایسا سلسلہ بھی متعارف کرایا جس نے دُنیائے علم و ادب میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔

سید ممتاز علی، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں سے بہرہ مند تھے اور اردو نثر میں اسلوب خاص کے حامل تھے۔ روشن فکری کچھ گورنمنٹ کالج کی فضا سے حاصل ہوئی تھی اور کچھ سر سید احمد خاں کے فیضان ارادت سے۔ زمانہ طالب علمی میں وہ اس دور کی ایک خاص روش کے مطابق اسلام کے بارے میں کچھ تشکیک کا شکار ہو گئے تھے۔

وہ سر سید ہی تھے جنھوں نے نہ صرف انھیں اسلام پر ثابت قدم رکھا بلکہ قرآن فہمی کے بارے میں اہم تصانیف کے بھی قابل بنایا۔

شیخ اسماعیل پانی پتی شمس العلماء سید ممتاز علی کی سوانحی تفصیلات، ان کی شخصیت اور علمی خدمات کے بارے میں صحیفہ تاج نمبر میں لکھتے ہیں:

"مولوی سید ممتاز علی صاحب اگرچہ اپنی قابلیت، تصنیفی لیاقت اور طویل صحافتی تجربے کے باعث ایک نامور اور مشہور شخص تھے مگر ان فضائل کے علاوہ اپنے اعلیٰ اخلاق اور اپنی عمدہ عادات کے لحاظ سے بھی آپ کا درجہ بہت بلند تھا۔ وہ نہایت نیک دل صاف باطن، پاک طینت، سنجیدہ اور متین انسان تھے، نیز مشرقی تہذیب کا ایک دلفریب نمونہ اور پرانے بزرگوں کی ایک جیتی جاگتی یادگار تھے۔ عامہ خلائق کی ہمدردی، انسانوں کی خدمت اور حاجت مندوں کی امداد اُن کا مخصوص شیوہ تھا۔ خاکساری اور فروتنی کا وہ ایک مجسمہ تھے۔ ہر شخص سے تواضع، محبت اور خلوص کے ساتھ ملنا اُن کا روزمرہ کا معمول تھا۔"

"انسانی ہمدردی مولوی صاحب کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ کسی کو تکلیف میں دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ ابتدائی زمانے میں جب وہ لاہور کے تحصیل بازار میں رہا کرتے تھے تو تحصیل کے کنواں میں اتفاقاً ایک آدمی گر پڑا۔ مولوی صاحب کو بھی خبر ہو گئی۔ آپ بھاگے بھاگے آئے اور وہاں کھڑے ہوئے لوگوں سے کہنے لگے کہ "جو آدمی اُس شخص کو کنویں میں سے نکال لائے گا میں اُسے دس روپے انعام دوں گا" دس روپے اُس زمانے میں ایک معقول رقم تھی، فوراً لوگ دوڑ پڑے اور اُسے کنویں میں سے زندہ وسلامت نکال لیا۔ مولوی صاحب کی ہمدردی کی بدولت اُس کی جان بچ گئی ورنہ وہیں مر کے رہ جاتا"۔

"ایک مرتبہ ایک بیوہ کا اِکلوتا بیٹا بیمار ہو کر مر گیا۔ وہ عورت مولوی صاحب کے ہمسائے میں رہتی تھی۔ مولوی صاحب کو بڑا رنج ہوا اور جب تک وہ زندہ رہی، مولوی

صاحب برابر باقاعدگی کے ساتھ اس کی مالی مدد کرتے رہے۔ اسی طرح آپ نے متعدد بیوہ عورتوں کے مستقل وظیفے مقرر کر رکھے تھے"۔

"مولوی صاحب کی ایک مخصوص عادت وقت کی پابندی تھی۔ ہمیشہ وقت پر اُٹھتے، وقت پر سوتے، وقت پر کھانا کھاتے اور وقت پر تفریح کے لیے باہر جایا کرتے تھے۔ غرض آپ کے جس قدر معمولات تھے، سب وقت پر ادا ہوتے تھے۔ مولوی صاحب کی باقاعدگی کا عالم یہ تھا کہ جب تک زندہ رہے کبھی ایک مرتبہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ دونوں پرچے ٹھیک وقت پر نہ نکلے ہوں"۔

"اپنے بچوں سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور حدیث "اکرموا اولادکم" پر بڑی خوش اسلوبی سے عمل کرتے تھے۔ دوپہر کے وقت تاج صاحب اپنے کمرے میں سوئے ہوتے تو اپنے نوکروں سے کہتے رہتے کہ کمرے کے باہر آہستہ چلیں، کہیں تاج کی آنکھ نہ کھل جائے۔ اُن کے بڑے صاحب زادے سید حمید علی ایک مرتبہ بیمار ہو گئے اور بیماری نے طول کھینچا تو مولوی صاحب نے اُن کے سرہانے بیٹھ کر ایک سو اٹھاسی مرتبہ قرآن مجید ختم کر کے اُن پر دم کیا۔ اُن کی لڑکی وحیدہ بیگم (زوجہ سر محمد یعقوب) مراد آباد میں سخت بیمار ہو گئیں۔ مولوی صاحب سب کام کاج چھوڑ کر مراد آباد تشریف لے گئے اور سات مہینے تک اُن کے علاج معالجے میں مصروف رہے۔

سید ممتاز علی خشک مزاج مولوی نہیں تھے بلکہ نہایت شگفتہ طبیعت اور بے حد بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ بعض لوگ بعض شہروں کے ناموں کے ساتھ "شریف" کا لفظ لگا دیا کرتے ہیں جیسے مکہ شریف، مدینہ شریف، بغداد شریف، پاک پتن شریف اور گولڑہ شریف وغیرہ، یہ کہاں تک جائز اور مناسب ہے مولوی صاحب نے ہنستے ہوئے فرمایا: جب مزاج شریف کہنا جائز اور مناسب ہے تو "اجمیر شریف" کہنا کیوں ناجائز اور نامناسب ہو گیا؟"۔

"متعدد اعلیٰ درجے کی علمی اور ادبی کتابیں اُنھوں نے لکھیں، جن میں سر

فہرست "تفصیل البیان فی مقاصد القرآن" ہے، مختلف موضوعات کے متعلق جس قدر مضامین قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں اور جس قدر ارشادات وہدایات اصلاح خلق کے لیے اس میں دی گئی ہیں، جس قدر عقائد اور احکامات اس میں موجود ہیں، جن جن اخلاق فاضلہ کی تعلیم اس میں دی گئی ہے، جن جن عادات رذیلہ سے روکا گیا ہے، ابتدائے آفرینش اور معاد کے متعلق اس میں جو جو کچھ فرمایا گیا ہے، رسالت اور نبوت کی جو تصریحات اس میں کی گئی ہیں اور انبیائے سابقین کے متعلق جو بیانات اس میں درج ہیں، ان سب کی مفصل تشریح پانچ ہزار سے زیادہ عنوانات کے ماتحت سات ضخیم اور مبسوط جلدوں میں مولوی صاحب نے کی ہے۔ کتاب کی تدوین نہایت قابلیت سے کی گئی ہے۔ ہر موضوع اور ہر عنوان کے ماتحت قرآن مجید کی جتنی آیات مختلف مقامات پر آئی ہیں، سب ایک جگہ مع ترجمہ اور حوالے کے کتاب میں درج کر دی گئی ہیں۔ مولوی صاحب کا یہ بہت بڑا علمی اور اسلامی کارنامہ ہے جو انھوں نے سالہا سال کی تلاش اور محنت کے بعد بڑی قابلیت سے انجام دیا۔

"پوری کتاب سات الگ الگ حصوں میں منقسم ہے"۔

مولوی صاحب کا ارادہ اس کتاب کا آٹھواں حصہ لکھنے کا بھی تھا جس میں آپ وہ تمام قرآنی آیات جمع کرتے جن میں کسی نہ کسی نہج سے نام لے کر یا بغیر نام کے مختلف اقوام گذشتہ اور ادیان متفرقہ کا ذکر آیا ہے مگر مولوی صاحب کو اس کے مرتب کرنے اور شائع کرنے کا موقع نہ ملا اور تھوڑے عرصے بعد ہی مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔

"مولوی صاحب مسلمانوں کے نہایت ہمدرد، اعلیٰ پایے کے مصنف، زبردست انشا پرداز، طبقہ نسواں کے محسن، بچوں کے نہایت شفیق، اسلامیات کے فاضل اور تعلیمات کے ماہر تھے۔ اسی وجہ سے آپ سالہا سال تک مسلم یونیورسٹی کورٹ علی گڑھ کے رُکن اور پنجاب یونیورسٹی سینٹ کے ممبر رہے۔ اور ان ہی فضائل و محاسن کے باعث آپ کو گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے ۱۹۳۴ء میں شمس العلماء کا

خطاب ملا"۔

" مولوی سید ممتاز علی کا دماغ بڑا تصنیفی واقع ہوا تھا اور اُن میں قدرت نے اپنے مافی الضمیر اور اپنے خیالات کو شائستہ الفاظ پیرائے میں بیان کر دینے کی بڑی قابلیت رکھی تھی۔ اگر مولوی صاحب کو عورتوں کی فلاح و بہبود اور بچوں کی تربیت و تعلیم کے کاموں سے فراغت ملتی تو یقیناوہ بہت سی نادر اور بیش بہا تصانیف کے خالق ہوتے۔ لیکن اس عدیم الفرصتی اور ہجوم کار کے باوجود مولوی صاحب نے متعدد علمی وادبی اور اصلاحی و تعلیمی کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں جو ادائے مطالب، ندرت بیان اور افادیت کے لحاظ سے خاص امتیاز رکھتی ہیں۔ مولوی صاحب کی لکھی ہوئی کتابیں حسب ذیل ہیں :

۱۔ حقوق نسواں۔

۲۔ سبیل الرشاد۔

۳۔ ثبوت واجب الوجود۔

۴۔ خزینۃ الاسرار۔

۵۔ شیخ حسن (ترجمہ)۔

۶۔ تذکرۃ الانبیاء۔

۷۔ ترجمہ زاد المعاد۔

۸۔ ترجمہء المنقذ من الضلال (از امام غزالی)۔

۹۔ خیر المقال۔

۱۰۔ ولادت مسیح (اس میں سر سید کی تقلید میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بے باپ کے نہیں ہوئی)۔

۱۱۔ رد الملاحدۃ۔

۱۲۔ فارسی آموز۔

۱۳۔ پرائمری کے طلبا کے لیے اُردو ریڈریں۔

۱۴۔ مڈل کے طلبا کے لیے اُردو کی نصابی کتابیں۔

۱۵۔ بچوں کو ہندسے سکھانے کا نقشہ۔

۱۶۔ اربعین۔

سید ممتاز علی نے ۱۵ جون ۱۹۳۵ء کو وفات پائی۔ جسد خاکی لاہور سے دیوبند لے جایا گیا، جہاں وہ اپنے خاندانی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

والدہ محترمہ :

سید امتیاز علی تاج کی والدہ سیدہ محمدی بیگم کے تفصیلی حالات شیخ اسماعیل پانی پتی نے صحیفہ تاج نمبر میں اپنے مقالے "تاج صاحب کے والدین" کے زیر عنوان درج کیے ہیں اور موصوفہ کی ادبی اور صحافتی خدمات پر جناب حنیف شاہد نے اسی شمارے میں "تاج صاحب کی والدہ" کے زیر عنوان اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ تکرار مطالب سے بچنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔

"تاج صاحب کی والدہ محترمہ سیدہ محمدی بیگم دہلی کی رہنے والی اور سید احمد شفیع اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی صاحبزادی تھیں۔ ان کا سال پیدائش ۱۸۷۹ء ہے اُس زمانے میں عورتوں میں تو کیا خود مردوں میں بھی تعلیم کا رواج بہت کم تھا۔ چنانچہ جب سر سید مسلمانوں کی تعلیم کا عزم لے کر اُٹھے تو ہر طرف سے ان کی شدید مخالفت کی گئی۔ اس ماحول میں تعجب ہے کہ محمدی بیگم کے والدین نے اپنی پیاری بچی کی بہترین تعلیم اور بہترین تربیت میں بہترین کوشش کی اور اُسے پوری طرح زیور تعلیم اور زیور تہذیب سے آراستہ کیا۔ چونکہ سعادت مند اور ہونہار بچی نے طبیعت نیک، عادات عمدہ،

دماغ اعلیٰ اور حافظہ قوی پایا تھا، اس لیے چھوٹی سی عمر میں ہی لکھنے پڑھنے، سینے پرونے، اور کھانے پکانے وغیرہ امور خانہ داری میں خاص مہارت پیدا کرلی۔ حصولِ علم کا جو ذوق محمدی بیگم کو بچپن سے تھا اُس میں مرتے دم تک فرق نہ آیا اور وہ برابر تحصیل علم میں ترقی کرتی گئیں"۔

"شادی کے قریباً دو برس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُنھیں ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو ایک چاند سا بیٹا عطا فرمایا جس کا نام باپ نے امتیاز رکھا۔ مگر ماں پیار سے اُس کو "میرا تاج" کہتی رہی۔ جسے بڑے ہو کر امتیاز علی نے اپنے نام کا جزو بنالیا۔

لائق اور قابل ماں نے اپنے لختِ جگر کی پرورش اور تربیت بڑے لاڈ اور پیار سے کی اور اُسے آرام و آسائش پہنچانے کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ وہ لوریاں دے کر اُسے سلاتی اور کہانیاں سنا کر بہلاتی تھی۔ وہ ننھے بچے کے کھانے پینے کے اطوار اور عادات ٹھیک اور درست رہیں اور اُس کی پرورش اور تربیت بہت عمدہ اور اعلیٰ پیمانے پر ہو۔ کہانیوں، لوریوں اور نظموں کی متعدد کتابیں محمدی بیگم نے ننھے تاج کے لیے لکھیں اور تاج کی بدولت قوم کے ہزاروں نونہالوں کے لیے بھی وہ کتابیں نہایت دل چسپی کا باعث ہوئیں۔

محمدی بیگم نے خاص ماؤں کے لیے بھی ایک ماہوار رسالہ ۱۹۰۴ء میں نکالا تھا جس کا نام " مشیر مادر" تھا جس میں ماؤں کے لیے نہایت مفید ہدایات اور مضامین درج ہوتے تھے، اور ماں کے جو فرائض عورت پر عائد ہوتے ہیں، اُن کی تشریحات اور تفصیلات اس پرچے میں شائع ہوتی تھیں بچوں کی نگہداشت، اُن کی تربیت اور تعلیم کے متعلق بھی نہایت کارآمد باتیں اس میں ہر ماہ چھپتی تھیں۔ غرض یہ رسالہ حقیقی اور صحیح معنوں میں ماؤں کے لیے ایک بہترین مشیر کا کام دیتا تھا اور محمدی بیگم اسے بڑی محنت سے ایڈٹ کرتی تھیں۔ مگر افسوس! یہ مفید اور کارآمد رسالہ زیادہ دیر تک جاری

نہیں رہ سکا کیونکہ تہذیب نسواں کو مرتب کرنے میں اُن کو سخت محنت کرنی پڑتی تھی کہ اُس کے ساتھ ایک علیحدہ ماہنامے کی ادارت کا بوجھ اُن کی برداشت سے باہر تھا۔ اس لیے مجبوراً اُسے بند کرنا پڑا۔ مگر ماؤں کو بہترین مشورے محمدی بیگم "تہذیب نسواں" کے ذریعے آخر وقت تک دیتی رہیں۔ صحیح معنوں میں یوں سمجھئے مشیر مادر کو محمدی بیگم نے تہذیب نسواں میں ضم کر دیا تھا"۔

"یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کل خواتین میں جو بیداری پائی جاتی ہے، اُس کی داغ بیل ملک میں سب سے پہلے محمدی بیگم نے تہذیب انسواں کے ذریعے ڈالی۔ اُنھوں نے نہ صرف اپنے مشن کے متعلق اپنے اخبار میں خود بکثرت مضامین لکھے اور مختلف خواتین سے لکھوانے بلکہ ۱۹۰۷ء میں عورتوں میں عمل کی روح پھونکنے کے لیے "انجمن خاتونان ہمدرد" کی بنیاد ڈالی جس کے ساتھ ہی ایک دار انسواں بھی تھا جس میں غریب اور نادار خواتین کی ہر ممکن امداد کی جاتی تھی اور اُنھیں مختلف دستکاریاں سکھا کر روزی کمانے کے قابل بنایا جاتا تھا"۔

اس کے کچھ سن بعد اُنھوں نے چند خواتین کے ساتھ مل کر ایک انجمن قائم کی جس کا نام "مجلس تہذیب نسواں" تھا اور محترم محمدی بیگم اس کی صدر تھیں۔ ان ہی عملی کوششوں کا نتیجہ بعد میں "لیڈیز کانفرنس" کی صورت میں ظاہر ہوا۔

اس قدر پے در پے، متواتر اور مسلسل محنت، مشقت اور مصروفیت کے باعث محمدی بیگم کی صحت نہایت گر گئی اور بہت علیل رہنے لگیں۔ لیکن اس حالت میں بھی برابر کام کیے گئیں۔ اور بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ تہذیب نسواں کو ایڈٹ کرتی رہیں۔ لیکن آخر کب تک؟ ایک دن آیا کہ یہ

الوالعزم اور بہت خاتون نہایت عاجز اور بے بس ہو کر پلنگ پر پڑ گئیں۔ بیماری نے طول کھینچا تو ڈاکٹری مشورے کے مطابق مولوی صاحب ان کو شملہ لے گئے تاکہ وہاں کی پر فضا اور خوشگوار آب و ہوا کے باعث اور کاموں سے بکلی فراغت کی وجہ سے دماغ کو سکون اور قوی کو آرام ملے۔ جگر جسم کے سارے اعضاء کام کرتے کرتے اس قدر شل ہو چکے تھے کہ کسی مقوی غذا اور کسی فرحت بخش فضا سے انھیں فائدہ نہیں ہوا۔ کمزوری اور ناطاقتی انتہا کو پہنچ گئی اور سارے اعضائے رئیسہ بیکار ہو کر رہ گئے۔ اسی حالت میں اُنھوں نے نہایت کرب و بے چینی کے ساتھ عین جوانی کے عالم میں بمقام شملہ بعمر تیس سال ۲ نومبر ۱۹۰۸ء کو وفات پائی اور دنیا ایک نہایت نیک دل، فیض رساں، ہمدرد اور نہایت قابل عورت سے خالی ہو گئی۔ جنازہ حسب وصیت لاہور لایا گیا اور لاہور کے مشہور قبرستان مومن پورہ (میکلوڈ روڈ) میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ قبر پختہ بنی ہوئی ہے اور غالباً مولوی سید ممتاز علی کی مصنفہ مندرجہ ذیل فارسی عبارت سنگ مرمر کی لوح پر کندہ ہے:

" کل من علیھا فان،

این است خواب گاہ محمدی بیگم اہلیہ سید ممتاز علی کہ خیلے بسیار کشیدہ و برائے افادہ ایشاں صحیفہ ہفت روزہ تہذیب نسواں اجرا نمود۔ پس از رنجوری شدید و علالت مدیدیہ عمر سی (۳۰) سال بمقام شملہ بتاریخ ۲ نومبر ۱۹۰۸ء رحلت کرد و حسب وصیت جسدش بہ لاہور آوردہ خاک نمودند"۔

"محمدی بیگم صاحبہ نے چوبیس سے زیادہ کتابیں لکھیں جو حسب ذیل ہیں:

۱ خانہ داری
۲ آدابِ ملاقات
۳ نعمت خانہ
۴ رفیق عروس
۵ خوابِ راحت
۶ حیاتِ اشرف
۷ سگھڑ بیٹی
۸ شریف بیٹی
۹ چندن ہار
۱۰ آج کل
۱۱ صفیہ بیگم
۱۲ سچے موتی
۱۳ انمول موتی
۱۴ آرسی
۱۵ امتیاز۔۔۔۔
۱۶ تاج پھول
۱۷ ریاض پھول
۱۸ تاج گیت
۱۹ تین بہنوں کی کہانیاں
۲۰ علی بابا چالیس چور
۲۱ دل پسند کہانیاں
۲۲ پان کی گلوری
۲۳ چوہے بلی نامہ
۲۴ دلچسپ کہانیاں
۲۵ مشیر مادر

(شیخ اسماعیل پانی پتی: صحیفہ تاج نمبر)

سیدہ محمدی بیگم کی ایک منفرد تالیف امتیاز پھلواری

یہ غالباً ۱۹۶۸ء کی بات ہے میں مجلس ترقی ادب لاہور کے عملہ ادارت میں شامل تھا اور سید امتیاز علی تاج (مرحوم) مجلس کے ناظم تھے۔ ایک روز ان سے رسالہ پھول کے اجرا اور بچوں کے ادب پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اس دوران تاج صاحب نے یہ دلچسپ بات بتائی کہ "جب میں بہت چھوٹا تھا تو میری والدہ نے میری تعلیم و تربیت کے لیے ایک نوٹ بُک تیار کی تھی، جس میں اُنھوں نے میرے لیے مختلف موضوعات پر چھوٹی چھوٹی آسان اور عام فہم نظمیں جمع کیں اور مختلف رسائل و اخبارات سے دلچسپ تصویریں کاٹ کر لگائیں۔ پھر ان تصویروں کو موضوع بنا کر ہر تصویر کے نیچے اپنے خاص اسلوب نگارش میں جو بچوں کے لیے دل چسپی اور کشش کا باعث ہوا کرتا تھا، مضامین اور کہانیاں لکھیں۔ میری والدہ محترمہ محمدی بیگم اس کاپی سے ہر روز مجھے کوئی کہانی یا نظم پڑھ کر سناتی تھیں اور نصیحت کرتی تھیں کہ جب میں بڑا ہو جاؤں تو ان کہانیوں کو نہ صرف یاد رکھوں بلکہ اس میں مذکورہ پند و نصائح پر عمل کروں" میں نے جب تاج صاحب سے دریافت کیا کہ آیا وہ بیاض ان کے پاس محفوظ ہے تو اُنھوں نے بہت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ وہ نادر تصنیف گم ہو چکی ہے اور اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ اس بات کو آج ۲۰ سال گزر رہے ہیں۔ پچھلے دنوں جب اسلام آباد میں واقع کتاب خانہ گنج بخش کے اُردو مخطوطات دیکھنے کا اتفاق ہوا تو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ محترمہ محمدی بیگم کی وہ نوٹ بُک جس کا ذکر سید امتیاز علی تاج (مرحوم) نے کیا تھا۔ اس کتاب خانے میں محفوظ ہے۔

محترمہ محمدی بیگم کی یہ تصنیف جو سکول نوٹ بُک کے ۱۰۶ صفحات پر مشتمل

ہے۔ "بچوں کا اخبار" کے عنوان سے ترتیب دی گئی ہے۔ اس کتاب کا عنوان میں نے سید امتیاز علی مرحوم کی زبانی "امتیاز پھلواری" سنا تھا۔ محترمہ محمدی بیگم کے قائم کردہ عنوان کی پوری عبارت درج ذیل ہے"۔

"بچوں کا اخبار

از محمدی بیگم، مرتبہ، مدیر تہذیب نسواں"۔

آغاز میں ۱۲ر مئی ۱۹۰۷ء کی تاریخ درج ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تصنیف کا آغاز اسی تاریخ کو ہوا۔ شروع میں ایک مختصر مقدمہ ہے جس کی عبارت درج ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"میرے پیارے امتیاز!

میں نے تمہارے پڑھنے کے واسطے یہ کاپی بنوائی ہے۔ میں اس میں تمہارے واسطے ہر روز نئی نئی باتیں لکھا کروں گی اور تم ہر روز پڑھا کرو اور مجھے سنایا کرو۔ جو بات تمہاری سمجھ میں نہ آوے تم میرے سے پوچھ لیا کرو۔

تم اس کاپی کو کتاب نہ جانو بلکہ اس کو اپنا کھلونا جانو اور دل چسپی سے پڑھو اس میں تم بہت سی باتیں کھیل اور ہنسی کی بھی دیکھو گے کام کی بھی۔ کھیل کی باتوں سے خوش ہونا، کام کی باتوں کو خوب طور پر یاد رکھنا، بھولنا نہیں۔ پھر تم دیکھو گے کہ تم کتنے اچھے بیٹے بن جاؤ گے۔ میں تم سے بہت خوش ہوں گی۔ اور تم کو انعام دوں گی لیکن جب مجھے یقین ہو گا کہ تم اس کاپی کو دل لگا کر پڑھتے ہو اور یاد رکھتے ہو۔"

یہ کتاب ۴۱ نثری مضامین، ۱۵ نظموں، ۶ معلوماتی موضوعات اور ۳ پند و نصائح پر مشتمل عنوانات پر مبنی ہے۔ مضامین زیادہ تر خود مصنفہ کے تحریر کردہ ہیں۔ نظمیں بھی چند ایک کے علاوہ مصنفہ ہی کی تخلیق کردہ ہیں۔ بعض کے آغاز میں تصنیف کی تاریخیں بھی درج کی گئی ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سارا مسودہ مئی کے مہینے ہی

میں ضبط تحریر میں لایا گیا تھا۔

جس طرح دیباچے سے ظاہر ہے، یہ مسودہ سید امتیاز علی تاج (مرحوم) کے لیے لکھا گیا تھا اور اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے بلاشبہ یہ ایک ماں کی طرف سے بیٹے کو انمول تحفے کا درجہ رکھتا ہے۔ سید امتیاز علی تاج ۱۳؍اکتوبر ۱۹۰۰ء کو پیدا ہوئے اس اعتبار سے "امتیاز پھلواری" کی تصنیف کے وقت ان کی عمر چھ سال سات ماہ تھی۔ دیباچے کا لہجہ بھی اس بات کا غماز ہے کہ مسودے میں لکھے گئے بعض مطالب ابھی بچے کی سمجھ سے بالاتر "جوبات تمہاری سمجھ نہ آوے وہ میرے سے پوچھ لیا کرو۔" اس تصنیف میں جن باتوں کو خاص طور پر مدنظر رکھا گیا ہے ان میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

۱۔ موضوعات اور مطالب کو بچے کی عمر، سمجھ، اور اخلاقی ضرورت کے مطابق سوچا اور منتخب کیا گیا ہے۔

۲۔ مندرجات میں معلومات عامہ، تاریخ، مذہب، روزمرہ، آداب اور پند و نصائح کو خاص جگہ دی گئی ہے۔

۳۔ زبان اس قدر شستہ، عام فہم اور مہذب ہے کہ بچے کے ذہن پر دُور رس نتائج مرتب کرتی ہے۔

۴۔ مضامین اور نظموں کے ذریعے بچوں کی متخیلہ، حافظہ اور مشاہدہ جیسی قوتوں اور صلاحتوں کو جلا اور نشو و نما دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

مزید گفتگو سے پہلے بے موقع نہ ہوگا کہ اس تصنیف کی فہرست مطالب پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

مضامین

۵۔ فرشتے
۶۔ ہمارا بدن
۷۔ بد صورت لڑکے کی تصویر
۸۔ ناراض بلی (تصویر کے عنوان پر)
۹۔ نیک لڑکے کی کہانی
۱۰۔ امیر حبیب اللہ خان، امیر کابل
۱۱۔ ایڈورڈ ہفتم
۱۲۔ بندے ماترم
۱۳۔ بڑے چھوٹے بھائی آپس میں مل کر کھیل رہے ہیں (تصویر کا عنوان)
۱۴۔ سودیش
۱۵۔ ابراہیم ادھم
۱۶۔ بہشت
۱۷۔ طاعون
۱۸۔ مجھے مت دیکھو (تصویر کا عنوان)
۱۹۔ کام
۲۰۔ موٹی بلی
۲۱۔ نواب صاحب بہاولپور
۲۲۔ جھنجھنا اور بچہ (تصویر)
۲۳۔ ننھے نواب بہاولپور
۲۴۔ اچھی عادتیں
۲۵۔ اچھے دوست
۲۶۔ اچھی باتیں اور اچھی عادتیں
۲۷۔ نماز پڑھنا
۲۸۔ زربانو لکھ رہی ہے
۲۹۔ مولانا شبلی
۳۰۔ کہنا نہ ماننے کی سزا
۳۱۔ قرآن مجید
۳۲۔ عربی لڑکی
۳۳۔ خوبصورت فراک والی لڑکی
۳۴۔ قلمدان
۳۵۔ خوبصورت کرسی
۳۶۔ چوہا
۳۷۔ سست لڑکی
۳۸۔ دو چھوٹے لڑکے
۳۹۔ شریر بچے کو سزا ملی
۴۰۔ بھولی لڑکی

منظومات

۱۔ نعت ۲۔ غازی (اکبر)
۳۔ ملمع کی انگوٹھی ۴۔ قلم
۵۔ کتاب ۶۔ چمن (از دل چسپ)
۷۔ نیند پلنگ ۸۔ سورج
۹۔ بہن بھائی کی محبت ۱۰۔ صبح
۱۱۔ دُعا ۱۲۔ نعت
۱۳۔ گلدستہ ۱۴۔ ماں کی محبت
۱۵۔ چائے دانی

معلومات

۱۔ ہندوستانی دنوں کے نام ۲۔ انگریزی میں دنوں کے نام
۳۔ انگریزی مہینوں کے نام ۴۔ گناہ (کن باتوں سے آدمی گناہگار ہو جاتا ہے۔)
۵۔ خبر (راولپنڈی میں جھگڑا) ۶۔ خبریں

پند و نصائح

۱۔ اچھی باتیں ۲۔ بہت بُرا ہے
۳۔ ڈرتے رہو۔

مسودے میں ہر نثر پارے کی پیشانی پر ایک تصویر چسپاں کی گئی ہے۔ سب مضامین تصویر چسپاں کرنے کے بعد تصویر کے عنوان کے تحت لکھے گئے معلوم ہوتے ہیں۔ مسودے پر پانچ مقامات پر تصویریں چسپاں کرنے کے بعد صفحات خالی چھوڑ دیے گئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید مصنفہ ان عنوانات پر مضامین لکھنا چاہتی تھیں۔

لیکن لکھ نہ پائیں۔ اس جگہ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ شاید مصنفہ کے زمانہ میں ہی یہ کاپی گم ہو گئی تھی ورنہ وہ اپنے جان سے پیارے فرزند کے لیے اس مسودے کو ادھورا اور نامکمل نہ چھوڑتیں۔ اگر یہ بات درست ہو تو ممکن ہے کہ سید امتیاز علی تاج نے بھی اس کاپی کو صرف بچپن ہی میں دیکھا ہو اور بعد میں اپنے والد یا گھر کے کسی بزرگ فرد سے مزید معلومات حاصل کی ہوں۔ اس بات کو اس امر سے بھی تقویت ملتی ہے کہ محترمہ محمدی بیگم کی وفات کے بعد ان کا بچوں کے ادب سے متعلق ہر مسودہ شائع کر دیا گیا تھا ان مطبوعہ کتابوں کی فہرستیں بھی محترمہ محمدی بیگم کے سوانح نگاروں نے پیش کر دی ہیں جن میں زیر نظر مسودے یعنی "بچوں کا اخبار" یا امتیاز پھلواری کا کوئی ذکر نہیں۔ شاید گمشدگی کے باعث یہ مسودہ اہل خانہ کے پاس موجود ہی نہ تھا۔ بہر حال کچھ بھی ہو اب یہ نادر مسودہ دریافت ہو چکا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ بچوں کے ادب میں یہ ایک نہایت خوب صورت اور باارزش اضافہ ہے۔

زیر مطالعہ مسودے کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اسلوب میں ممتا کے جذبات واحساسات کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔ اس کے ہر جملے میں ممتا کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور ہر مضمون کے اختتام پر دُعا سنائی دیتی ہے۔ اس مسودے کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ آج سے پون صدی پہلے کی مسلمان مائیں اپنے بچوں کی ذہنی، فکری اور روحانی تربیت کے لیے نہ صرف دل و جان سے کوشاں رہتی تھیں بلکہ وہ اُن کی شخصیت کو تہذیب و شائستگی کا ایک خاص رویہ بھی دینا چاہتی تھیں۔

"امتیاز پھلواری" اُردو میں بچوں کے ادب پر ایک نادر تصنیف ہے۔ اُردو میں بچوں کے ادب کا تذکرہ رسالہ پھول کے ذکر کے بغیر ہمیشہ ادھورا رہتا ہے۔ "پھول" ایک جریدہ ہی نہ تھا بلکہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اُسے ایک ادارے کی حیثیت حاصل رہی ہے اس کا اسلوب بچوں کی ذہنی نشوونما میں مددگار ثابت ہوا اور اس میں

بچوں کے ذوق مطالعہ کو تحریک دینے کا عنصر غالب رہا۔ اگر "پھول" کی اس خصوصیت کو مد نظر رکھا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ "پھول" کے اسلوب میں سیدہ محمدی بیگم کے اسلوب کی خوشبو رچ بس گئی تھی۔ "امتیاز پھلواری" کو سیدہ محمدی بیگم کی دیگر تصانیف میں اس لیے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس کے اسلوب میں جو ذاتی وابستگی اور جذباتی تعلق نظر آتا ہے وہ دوسری تصانیف کے حصے میں نہیں آیا۔ بے موقع نہ ہوگا اگر اس دلچسپ تصنیف سے چند اقتباس درج کر دیے جائیں:

کوثر

آسمان پر بہشت ہے۔ اس میں بہت خوبصورت باغ ہے۔ ایسے ایسے مزے کے پھل اور ایسے اچھے اچھے پرندے ہیں کہ دُنیا میں کہیں نہیں۔ ایک بہت ہی خوبصورت درخت ہے۔ اس کا نام طوبیٰ ہے۔ بہشت کے باغ میں کئی نہریں ہیں۔ ان کا پانی دودھ سے زیادہ صاف اور شربت سے زیادہ میٹھا اور بہت خوشبودار ہے۔ ایک نہر کا نام تسنیم ہے۔ ایک کا نام سلسبیل ہے۔ ایک کا نام کوثر ہے۔

بہشت میں ایک بہت خوبصورت حوض ہے۔ اس کا نام بھی کوثر ہے۔ جو لوگ دُنیا میں اچھے اچھے کام کریں گے۔ انھیں آنحضرتؐ حوض کوثر میں سے خود گلاس بھر بھر کے پلائیں گے۔ تب ان پینے والوں کو بہت خوشی ہوگی۔

کوثر میں جو پانی ہے تو جنت میں ہیں میوے
پیتے ہیں نمازی، انھیں کھاتے ہیں نمازی

ہمارا بدن

خدا نے ہمارا بدن بہت کاریگری سے بنایا ہے۔ سب سے اُوپر ہمارا سر ہے اس میں ہمارا چہرہ بھی شامل ہے۔ چہرے پر دو آنکھیں ہیں۔ جن سے ہم سب کچھ دیکھتے ہیں۔ دائیں بائیں دو کان ہیں۔ ان سے ہم سنتے ہیں۔ چہرہ کے بیچ میں ناک ہے۔

ناک میں دو سوراخ ہیں۔ ان سوراخوں سے ہم سانس بھی لیتے ہیں اور خوشبو، بدبو بھی سونگھتے ہیں۔ ناک سے نیچے ہمارا منہ ہے۔ اس سے بھی ہم سانس لیتے ہیں۔ منہ میں زبان ہے۔ زبان سے ہم بولتے ہیں اور ہر ایک چیز کا مزا چکھتے ہیں۔ منہ میں نیچے اُوپر دانتوں کی دو قطاریں ہیں۔ ان سے ہم کھانا کھاتے ہیں اور کھانے کو چباتے ہیں۔ ہمارا سر ہماری گردن پر رکھا ہے۔ جس سے ہم اپنے سر کو اِدھر اُدھر گھما سکتے ہیں۔ گردن ہمارے دھڑ کے ساتھ جڑی ہے۔ دھڑ کے اُوپر کی جانب دو بازو ہیں۔ جن میں دو ہاتھ لگے ہوتے ہیں۔ دونوں ہاتھوں میں انگلیاں ہیں۔ ایک ایک ہاتھ میں پانچ پانچ انگلیاں ہیں۔ ان سے ہم چیزیں پکڑتے ہیں۔ دھڑ کے نیچے کی طرف دو ٹانگیں ہیں ان میں دو پاؤں لگے ہیں جن سے ہم راستہ چلتے ہیں۔ اور بہت سی عجیب عجیب چیزیں ہمارے جسم میں ہیں۔ جن کا بیان آگے آئے گا۔

قلم

میرے ہاتھ میں اے قلم جلد آجا
مجھے آکے اچھا سا لکھنا سکھا جا
میں خط اپنے ابا کو تجھ سے لکھوں گا
اور انعام میں ان سے پیسے نہ لوں گا
قلمدان اچھا سا اک مول لاکر
میں رکھوں گا تجھ کو پھر اس میں سجا کر

ڈرتے رہو

۱۔ چغلی کھانے والے لڑکوں سے۔
۲۔ سانپ، بچھو، بھڑوں سے۔
۳۔ کسی سے پیسہ اُدھار لینے سے۔

گناہ

کن کن باتوں کے کرنے سے آدمی گنہگار ہو جاتا ہے۔ ان کو نیچے لکھا جاتا ہے۔ غور سے پڑھو اور کوشش کرو کہ ایسے کام تم سے نہ ہوں۔

۱۔ جھوٹ بولنا بہت گناہ ہے۔

۲۔ چغلی کھانی بھی گناہ ہے۔

۳۔ چوری کرنا گناہ ہے۔

۴۔ اپنی ماؤں کو ستانا گناہ ہے۔

۵۔ کسی غریب کو ستانا گناہ ہے۔

۶۔ کسی کی چیز کو بغیر اس کی اجازت لے لینا گناہ ہے۔

مولانا شبلی

مولانا شبلی بڑے لائق شخص ہیں۔ انہوں نے اردو میں کئی کتابیں لکھی ہیں اور بہت اچھے اچھے کام کیے ہیں۔ تمہارے ابا کے دوست ہیں۔ ۱۷ مئی کو انھیں بہت سخت تکلیف پہنچی۔ ایک بندوق بھری رکھی تھی۔ وہ انہوں نے اپنے ہاتھ میں اٹھالی۔ بندوق کا گھوڑا گر گیا اور بندوق چل پڑی۔ مولوی شبلی صاحب کا پاؤں قریب تھا۔ بندوق کے چھرے پاؤں میں لگے اور ایسی چوٹ آئی کہ پاؤں ٹخنے سے الگ ہو گیا۔ گھر میں سب رونے چلانے لگے۔ ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے نصف پنڈلی تک پاؤں کاٹ دیا۔ اب کچھ آرام ہے۔ خدا جلد اچھا کرے۔[۱]

۱: مولانا شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو انتقال کیا۔ پابریدگی کا واقعہ ۱۹۰۷ء کو پیش آیا۔ مولانا کا شعر ہے۔

شبلی نامہ سیہ را بجزائے عملش
پا بریدند و صدا خواست کہ سر می بایست

زیر نظر تحریر اس واقعہ کی اولین ہم عصر شہادت ہے۔ مولانا شبلی کے سوانحی کوائف کے لیے دیکھیے۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی۔ شبلی نامہ، شیخ محمد اکرام۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مقالہ از ڈاکٹر سید عبداللہ۔ (گ۔ن)

نانا جان

جس طرح گزشتہ سطور میں بیان کیا گیا، سید امتیاز علی تاج کے نانا جان اور سیدہ محمدی بیگم کے والد محترم کا نام سید احمد شفیع تھا اور وہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ سیدہ محمدی بیگم ان کی پہلی بیوی کی اولاد سے تھیں۔ ان سے بڑی صاحبزادی کا نام سیدہ مبارک بیگم تھا۔ سید احمد شفیع کی دوسری بیوی غالباً سیدہ محمدی بیگم اور سیدہ مبارک بیگم کی خالہ تھیں۔ اس بیوی سے بیٹے ہوئے جن میں ایک بیٹے غالباً عزیز الشفیع کی شادی ۱۹۰۵ء میں ہوئی۔ اس وقت تک سید احمد شفیع انتقال کر چکے تھے۔ سیدہ محمدی بیگم کی ایک خود نوشت بیاض کتاب خانہ گنج بخش اسلام آباد میں محفوظ ہے جس کی رو سے سیدہ محمدی بیگم نے لاہور سے دہلی جا کر بھائی کی شادی میں شرکت کی تھی۔

سید احمد شفیع، جس طرح مختلف ماخذ سے ظاہر ہے، سیدہ محمدی بیگم کی شادی پر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے عمر کا بڑا حصہ سر سید احمد خاں کی دوستی اور ارادتمندی میں گزارا تھا اور گمان غالب ہے کہ سید ممتاز علی سے رشتے داری قائم کرنے میں ایک یہ عنصر بھی شامل ہو گا کہ سید ممتاز علی بھی سر سید کے ارادتمند اور احباب خاص میں شامل تھے۔

سید احمد شفیع نے اپنی ملازمت کا آغاز انگریزی پلٹن کے ایک رسالے سے کیا تھا لیکن علم وادب اور درس وتدریس میں خاص شغف کے باعث انھیں فوجی ملازمت سے آزاد کر کے ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ ہائی سکول وزیر آباد کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا۔ اسی جگہ درس وتدریس کے ساتھ ساتھ اُن کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا اور اُنھوں نے سائنس، فلسفہ، نفسیات اور تعلیم کے بارے میں کتابیں لکھیں۔ سید احمد شفیع انگریزی زبان پر غیر معمولی دسترس رکھتے تھے۔ جو علوم جدیدہ کے بارے معلومات سے بہرہ مند ہونے کے لیے ان کی مددگار ثابت ہوئی۔ سید احمد شفیع کی اہم تصانیف میں ثبوت واجب

الوجود، حافظہ احمدی، تبرید احمدی، پولیٹیکل مضامین، رفیق کتخدا، خواب حیرت، رسالہ موانع ترقی تعلیم مسلمانان ہند اور تذکرہ تیمور قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے پولیٹیکل مضامین اور تذکرہ تیمور کے علاوہ تمام کتابیں مطبوعہ یا مسودات کی صورت میں راقم الحروف کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں۔ رسالہ موانع ترقی تعلیم مسلمانان ہند تا حال غیر مطبوعہ ہے لیکن اس کا خلاصہ سر سید احمد خاں نے اپنی ایک رپورٹ مطبوعہ ۱۸۷۴ء میں شائع کر دیا تھا۔ حافظہ احمدی ۱۸۷۱ء میں لکھی گئی اور ۱۸۷۴ء میں اسے سر سید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس سے شائع کیا۔ اس کے مقدمے اور سبب تالیف میں سید احمد شفیع نے اپنے حالات زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ بے موقع نہ ہوگا اگر اس کا ایک اقتباس یہاں قارئین کی دلچسپی کے لیے نقل کر دیا جائے:

اقتباس

"ضمیر پر تنویر ناظرین با تمکین پر روشن ہو کہ راقم الاوراق علوم شرقیہ کی تحصیلِ رسمیہ کے بعد ملکہ معظمہ کے رسالہ ہفتم ڈریگون گارڈز نامی مقیم سیالکوٹ میں بعہدہ، میر منشی ممتاز ہوا۔ اسی عالم روزگار میں تحصیل زبان انگریزی کا شوق بے انداز ہوا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۵۹ء کے درمیان چرچ آف اسکاٹ لینڈ مشن سکول سیالکوٹ میں داخل ہوا۔ ریورنڈ جان ٹیلر صاحب و پیٹرسن صاحب بہادر اس وقت اس مدرسہ کے مالک و مہتمم تھے نہایت ہی مہربان۔ جس وقت خدمات رسالہ اور چند افسروں کے پڑھانے سے فراغت پا کر مدرسہ جاتا خوشی سے پڑھا دیتے ایک سال اسی طرح پڑھتا رہا۔ ازاں بعد رجمنٹل سکول ماسٹر اور چند صاحبان والا شان کی عنایت اور شفقت پر اکتساب انگریزی کا دارومدار ہوا۔ اسکول ماسٹر صاحب گوروں اور ان کے بچوں کی جماعت میں بٹھا کر پڑھاتے۔

جورنج کے مطالعہ میں نہ سمجھتا صاحب لوگ سمجھاتے۔ صاحبان بلند مکان کی خدمت میں روزمرہ حاضر ہونے اور گورے لوگوں کے ساتھ ہر وقت میل مطابقت رکھنے سے بسا اوقات انگریزی بولنی پڑتی۔ خاص کر اسی باعث ہیچ مندان کو انگریزی سے گونہ واقفیت حاصل ہوئی۔ اور قریب تین سال کے رسالہ میں پڑھنے پڑھانے کا یہی وتیرہ رہا۔ پس ازاں جب تھانے کے پہاڑیوں کی سرزنش وسرکوبی کے واسطے رسالہ انبالہ سے روانہ ہوا تو اس کے ساتھ چلا۔ مگر جہلم اُترنے سے پیشتر ہی صلح ہو چکی تھی۔ اس واسطے حکم ہوا کہ اول رسالہ جانب لاہور واپس آوے پھر اپنی نئی چھاونی متھرا کو چلا جاوے۔ اس حکم کے ساتھ ہی واپس ہوئے وزیر آباد پہنچے۔ یہاں ٹیلر صاحب و پیٹرسن صاحب بہادر کی ملازمت سے مشرف ہوا۔ فرمانے لگے کہ احمد شفیع رسالہ کی نوکری چھوڑ کر ہمارے مدرسہ وزیر آباد کی ہیڈ ماسٹری منظور کرو چونکہ محسن تھے ارشاد ان کا قبول کیا۔ رسالہ کی اسامی سے مستعفی ہوا۔ جب آنے لگا صاحبان قدردان نے نہایت اسناد عطا کیے۔ انھیں لے کر وزیر آباد پہنچا۔ گیارہویں تاریخ کو ماہ جنوری سنہ ۱۸۶۴ء کو مدرسہ کا چارج لیا۔ اس وقت سے تادم حال اسی مدرسہ میں تقرر ہے۔ پر افسوس کہ دو مربیوں میں سے ایک ٹیلر صاحب بہادر نامی اس جہان گذراں سے انتقال کر گئے دوسرے پیٹرسن صاحب بہادر ولایت خود سمت اسکاٹ لینڈ کو مراجعت فرما گئے۔ ان کے جانشین لائینگ صاحب بہادر بھی ان ہی کی مانند مہربان ہیں۔"

سید احمد شفیع کی تصنیف تمرید احمدی بھی ۱۸۷۴ء میں انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ نے ہی شائع کی۔ گمان غالب ہے کہ سرسید نے ان کتابوں کو مدرستہ العلوم علی گڑھ کے نصاب میں شامل کیا ہوگا۔ ان کی تصنیف خواب حیرت ۱۸۹۰ء میں اور تذکرہ

تیمور ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئیں۔ سید احمد شفیع کی سوانحی تفصیلات کا یہ موقع نہیں اُن کے سوانح اور علمی خدمات پر میں کام کر رہا ہوں۔

سید امتیاز علی تاج

سید امتیاز علی تاج، شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی کی اولاد میں سب سے چھوٹے تھے۔ اُن سے بڑی ایک بہن سیدہ وحیدہ بیگم اور ایک بڑے بھائی سید حمید علی، سید ممتاز علی کی پہلی بیوی محترمہ حمیدہ بیگم کے بطن سے تھے جس طرح پہلے عرض کیا گیا۔ محترمہ حمیدہ بیگم نے جب ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا تو مولوی صاحب نے صغیر سن بچوں کی پرورش اور گھر کی نگرانی کے لیے ۱۸۹۷ء میں سیدہ محمدی بیگم سے دوسرا نکاح کیا جن سے ۱۳۔ اکتوبر ۱۹۰۰ کو سید امتیاز علی تاج پیدا ہوئے۔ مولوی سید ممتاز علی کی اولاد کا شجرہ حسب ذیل ہے۔
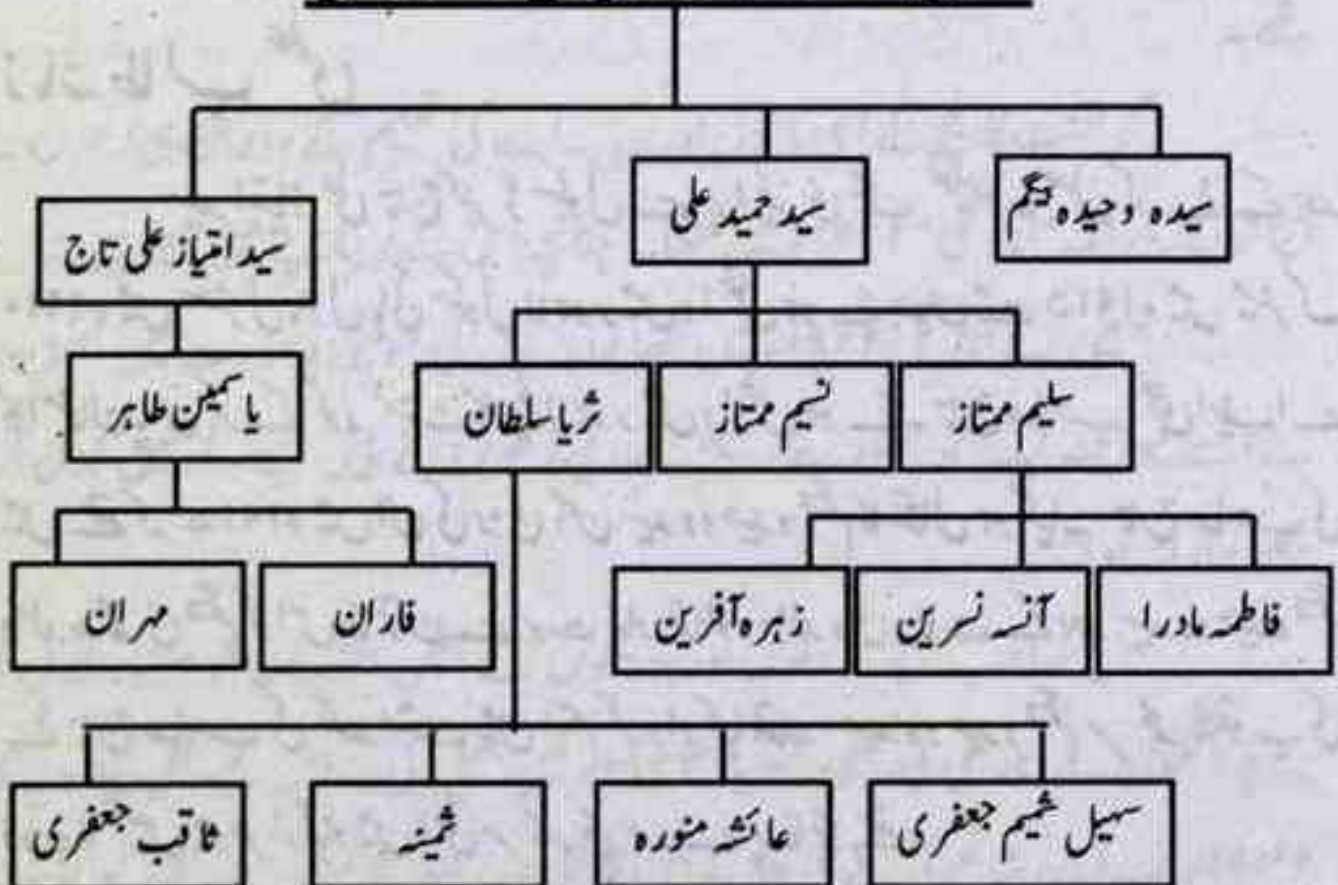
سیدہ محمدی بیگم کے روزنامے مجھے فخرونہ کتاخانہ گنج بخش اسلام آباد سے معلوم ہوتا ہے کہ سید امتیاز علی تاج بچپن میں سخت علیل ہو گئے تھے۔ حکیم اجمل خان دہلوی کے علاج سے اللہ تعالیٰ نے دوبارہ زندگی عطا کی۔ اپنی اسی قسم کی ایک دوسری علالت کا ذکر بھی تاج

صاحب کیا کرتے تھے جس میں اُنھیں معدے کا السر ہو گیا تھا۔ ڈاکٹری علاج ہوا اور ڈاکٹروں کی تجویز سے مولوی سید ممتاز علی اُنھیں مزید علاج کے لیے یورپ بھجوا رہے تھے کہ اسی دوران لاہور کے معروف طبیب اور علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کے دوست حکیم فقیر محمد چشتی نے تاج صاحب کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ڈاکٹروں کی دوائی روک کر ان کی دوائی استعمال کریں۔ سید امتیاز علی تاج کہتے تھے کہ میں نے ڈاکٹر کی دوائی چھپا دی اور والد صاحب سے چوری چھپے حکیم صاحب کی دوائی استعمال کرنے لگا کیونکہ مولوی سید ممتاز علی کو ڈاکٹری علاج پر زیادہ بھروسا تھا۔ چند روز میں حکیم فقیر محمد چشتی کے علاج نے اثر دکھایا اور السر ناپید ہونا شروع ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے اسے اپنے علاج کا کرشمہ ظاہر کیا لیکن تاج صاحب نے اپنے والد صاحب سے اصل حقیقت بیان کر دی اور یوں سید امتیاز علی تاج یورپ کے سفر پر روانہ نہ ہو سکے۔

زمانہ طالب علمی

سید امتیاز علی تاج کنیرڈ سکول سے پرائمری تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۰ء میں سنٹرل ماڈل ہائی سکول لاہور میں داخل ہوئے جہاں سے ۱۹۱۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ تاج صاحب ابھی ایف اے میں تھے کہ ۱۹۱۷ء میں ان کی بڑی بہن سیدہ وحیدہ بیگم کا انتقال ہو گیا۔ تاج صاحب کی والدہ محمدی بیگم کو اس خاتون سے بہت پیار تھا اور والدہ کی وفات کے بعد سیدہ وحیدہ بیگم نے تاج صاحب کی نگہداشت میں اہم کردار کیا تھا۔ سیدہ وحیدہ بیگم سر محمد یعقوب کی زوجہ تھیں جو مراد آباد میں اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔

دوران تعلیم ہی تاج صاحب نے اپنے والد شمس العلماء مولوی ممتاز علی کی اجازت سے نہ صرف تہذیب نسواں اور پھول کی ادارت کے فرائض انجام دیے بلکہ ستمبر ۱۹۱۸ء میں ایک ادبی ماہنامہ کہکشاں کے نام سے جاری کیا۔ یہ مجلّہ گیارہ مہینے تک

جاری رہا لیکن چونکہ تاج صاحب کو ان اشاعتی ذمہ داریوں کے ساتھ تعلیمی سرگرمیوں کے لیے زیادہ وقت نہیں ملتا تھا لہٰذا اُنھوں نے تعلیم میں بہتر کارگردگی کے لیے جولائی ۱۹۲۰ء میں ماہنامہ کہکشاں بند کر دیا اور اپنی تمام توجہ تعلیم پر مبذول کر دی۔ ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔

گورنمنٹ کالج میں حصول تعلیم کے دوران سید امتیاز علی تاج کو ڈراما نگاری سے دل چسپی پیدا ہوئی۔ جس کی تفصیلات اُنھوں نے گورنمنٹ کالج ڈرامیٹک کلب پر اپنے مضمون میں بیان کی ہیں۔ اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے تاج صاحب حکیم احمد شجاع کو بہت یاد کیا کرتے تھے۔ تاج صاحب کہتے تھے کہ حکیم صاحب اس وقت بھی ڈرامہ نگاری کی ایک اہم شخصیت تسلیم کیے جاتے تھے اور جب بھی وہ ڈرامیٹک کلب کے جلسے میں ہم میں سے کسی کا ڈراما سننے یا دیکھنے آتے تھے تو ہم اس پر بے حد فخر محسوس کرتے تھے۔

گورنمنٹ کالج کے اسی ماحول اور بی۔اے کی تعلیم کے دوران ہی اُنھوں نے اپنا شاہکار ڈرامہ "انارکلی" ۱۹۲۲ء میں لکھا۔ چنانچہ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"میں نے انارکلی ۱۹۲۲ء میں لکھا تھا۔ اس کی موجودہ صورت میں تھیٹروں نے اسے قبول نہ کیا۔ جو مشورے ترمیم کے لیے اُنھوں نے پیش کیے، اُنھیں قبول کرنا مجھے گوارا نہ ہوا"

تاج صاحب نے دوستوں اور بزرگوں کے بعض مشوروں کو ضرور قبول کیا چنانچہ اُنھوں نے انارکلی کی حتمی تسوید ۱۹۲۳ء میں مکمل کی۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ ۱۹۳۲ء تک اسے شائع کرنے کی بجائے اس کا سٹیج سے رابطہ قائم کرنے کے لیے لاہور، دہلی اور الہ آباد کی مختلف تھیٹریکل کمپنیوں کے مالکان سے بات چیت کرتے رہے۔ تاج صاحب نے اس دوران یہ ڈراما آغا حشر کو بھی سنایا اور بعض مکالموں پر ان سے داد حاصل کی۔ تاج صاحب آغا حشر کے ان الفاظ کو بڑے فخر سے دہراتے تھے کہ انھوں نے فرمایا

"حشر تو یہ سمجھتا تھا کہ اس کے بعد ڈراما مر جائے گا لیکن اردو ڈرامے کی بہار کے دن تو اب شروع ہوئے ہیں۔"

گورنمنٹ کالج میں تاج صاحب کو جن ہستیوں کی رفاقت میسر آئی اُن میں پطرس بخاری، رفیع پیر، شیخ نورالٰہی اور حکیم احمد شجاع قابلِ ذکر ہیں۔ تاج صاحب کا ان سب بزرگوں سے ارادت اور محبت کا رشتہ عمر بھر قائم رہا۔ زمانہ طالب علمی میں ہی عبدالمجید سالک سے دوستی ہوئی۔ جنھیں مولوی سید ممتاز علی نے "تہذیب نسواں" اور "پھول" کے لیے نائب مدیر مقرر کیا تھا۔

زمانہ طالب علمی میں تاج صاحب کو ڈراما نگاری کے ساتھ ساتھ مضمون نویسی کا بھی شوق تھا اور ان کے مضامین اردو کے معیاری جرائد میں شائع ہونے لگے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے مضمون نویسی کا اسلوب انشاء پردازی سے آگے نہ بڑھ سکا اور اس مضامین میں علمی رنگ پیدا نہ ہو پایا جس کی شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی کو بیٹے کی تحریروں سے غالباً اُمید تھی۔ چنانچہ سید امتیاز علی تاج اپنے والد گرامی کے حوالے سے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جن دنوں میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں تعلیم پاتا تھا۔ والد ماجد شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی صاحب نے ایک بار مجھ سے فرمایا۔ سنتے ہیں تم نے ادبی مضامین لکھنے شروع کر دیے ہیں۔ اپنی لکھی ہوئی کوئی چیز ہمیں بھی تو سناؤ۔

واقعہ یہ ہے کہ میں نے مضمون نویسی وقت سے کچھ پہلے شروع کر دی تھی چودہ سال کا تھا تو میرا ایک ادبی مضمون آگرے کے رسالہ نقاد میں شائع ہو گیا تھا۔ نقاد اُس زمانے کے چوٹی کے رسالوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس میں مضمون شائع ہونے کے معنی یہ تھے کہ میں نے صفِ اول کے ادیبوں میں جگہ پالی۔ اپنے کمال پر میں پھولا نہ سماتا تھا۔ والد صاحب نے مضمون سننے کی

فرمائش کی تو تھوڑے سے توقف کے بعد بھاگا گیا اور اپنے کمرے میں سے اپنا تازہ ترین مضمون اُٹھا لایا۔ اب یاد نہیں مضمون کا عنوان کیا تھا۔ اتنا خیال البتہ ہے کہ اُس زمانے میں وہ مضمون میرے نزدیک بے مثال اور جس رسالے میں شائع ہوا تھا اُس کی جان تھا۔

میں نے مضمون پڑھا اور والد صاحب نے خاموشی سے سننا شروع کیا یہاں تک تو کچھ مضائقہ نہیں تھا۔ ان کی متانت سے مجھے توقع ہی نہ تھی کہ مضمون کے دوران بغیر سنے وہ کسی قسم کی داد دیں گے لیکن جب مضمون سن چکنے کے بعد بھی وہ خاموش ہی رہے تو اُچنبھا ہوا اور کچھ سمجھ میں نہ آسکا کہ ایسی صورت میں کیا کرنا مناسب ہوگا۔ کچھ تامل کے بعد دل کڑا کر کے آخر خود ہی پوچھنا پڑا مضمون آپ کو کیسا معلوم ہوا؟

والد ماجد نے ذرا سے توقف کے بعد جس کے دوران وہ بھی غالباً دل کڑا کر رہے تھے فرمایا۔ "بھوسی بھوسی ہے۔ کوئی دانہ تو اس میں ملا نہیں"۔ (صحیفہ : ۱۹۷۱ء)

گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے کرنے کے بعد سید امتیاز علی تاج نے اپنے والد گرامی کے ساتھ اشاعتی کاموں میں ہاتھ بٹانا شروع کیا اور تہذیب نسواں کے ساتھ ساتھ پھول کی ادارت بھی سنبھالی۔ پھول ہی میں اُنھوں نے اپنے مزاحیہ مضامین کا سلسلہ "چچا چھکن" کے زیر عنوان شروع کیا۔

شادی

تہذیب نسواں کے ذریعے خواتین اہل قلم کی ایک کہکشاں ترتیب پا رہی تھی۔ تہذیب نسواں محمدی بیگم، مولوی سید ممتاز علی ایک ایسی مثلث کا نام تھا جو اپنے زاویوں میں اردو کے نئے امکانات پیدا کر رہی تھی۔ برصغیر کی تمام اہل قلم خواتین تہذیب

نسواں میں اپنی تحریروں کی اشاعت کو ایک خوب صُورت خواب سمجھ رہی تھیں جس کی تعبیر پر معاشرے کا یہ طبقہ سر سید احمد خاں کی مخالفت کے باوجود تاریخ ادب کا ایک اہم کردار بننے والا تھا۔ انہی اہل قلم خواتین میں ایک عباسی بیگم بھی تھیں، جن کا تعلق ہر چند کہ حیدرآباد دکن سے تھا لیکن ان کے میاں نواب محمد اسماعیل مدراس میں قیام پزیر تھے۔ عباسی بیگم کی صاحبزادی حجاب اسماعیل بھی جو کہ خود ترقی یافتہ ذہن کی مالک پڑھی لکھی لڑکی تھیں اپنی تحریریں تہذیب نسواں میں اشاعت کے لیے بھیجتی تھیں۔ سید امتیاز علی تاج حجاب اسماعیل کی ذہانت سے متاثر تھے اور ان کے درمیاں باقاعدہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ اسی تعلق خاطر نے بالآخر دونوں کو رشتہ ازدواج میں پرو دیا۔ مس انور مرزا نے ایم۔اے اردو کے لیے لکھے گئے اپنے تحقیقی مقالے میں محترمہ حجاب امتیاز علی کا ایک بیان نقل کیا جو مس انور مرزا کی زبانی درج ذیل ہے :۔

"اُن کی والدہ عباسی بیگم تہذیب نسواں میں اپنی تحریریں بھیجتی رہتی تھیں۔ مولانا ممتاز علی صاحب یعنی تاج صاحب کے والد اس رسالے کے مدیر تھے۔ ان سے اور عباسی بیگم سے اکثر خط و کتابت رہتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد دونوں خاندانوں میں رشتہ داروں جیسے تعلقات ہو گئے۔ تاج صاحب کے بہنوئی سر محمد یعقوب اور سجاد حیدر یلدرم صاحب نے اس شادی کی تحریک کی۔ تاج صاحب خود مدراس پہنچ گئے۔ اس طرح پہلی مرتبہ بیگم حجاب ممتاز علی تاج صاحب سے ملیں کچھ عرصے کے بعد یہ شادی ہو گئی۔

(انور مرزا حوالہ امتیاز علی تاج از عبدالحفیظ صحیفہ ۲۹)

اس سے ملتے جلتے بیگم حجاب امتیاز علی کے وہ الفاظ بھی سُنیئے جو ستار طاہر نے اپنے مضمون حجاب امتیاز علی تاج سے ایک ملاقات میں درج کئے ہیں۔ یہ مضمون ماہنامہ کتاب لاہور کے تاج نمبر بابت جون ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مطالب جناب ستار طاہر نے بغیر حوالہ دیئے بیگم حجاب کے کسی ایسے مطبوعہ انٹرویو سے لیے ہیں جو اُنھوں نے

کسی خاتون کو دیا ہو گا۔ چند جملے ملاحظ فرمائیے :

" بہت شکریہ۔۔۔آپ تشریف لائیں میں اچھی ہو گئی"۔

آیئے بہن۔۔۔آیئے آپ نے بڑی زحمت کی۔۔۔ہاں امتیاز شہید ہو گئے"۔

اپنی شادی کے بارے میں بیگم حجاب امتیاز علی کے الفاظ درج ذیل ہیں :۔

"فاصلہ۔۔۔ کتنا بڑا فاصلہ تھا جو مٹ گیا۔ امتیاز کی والدہ نے پنجاب کی مسلمان عورتوں کے حقوق اور آزادی کے لیے بڑا کام کیا۔ تہذیب نسواں میں میری والدہ عباسی بیگم بھی لکھا کرتی تھیں۔ ہم رہتے تو حیدر آباد دکن میں تھے مگر جب کوئی وبا پھیلتی تو مدراس چلے جاتے۔۔۔جی ہاں۔۔۔دکن کی اپنی تہذیب ہے، اپنا معاشرہ ہے۔ میں نے تہذیب نسواں کے لیے لکھنا شروع کیا۔ امتیاز بھی اس میں دل چسپی لیتے تھے۔ تہذیب نسواں کے لکھنے والے دُور رہنے کے باوجود ایک رشتے میں منسلک تھے۔ سب کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے، ایک کنبہ تھا جس کے ہم سب افراد تھے۔ میری امتیاز سے خط وکتابت تھی ایک بار یوں ہوا کہ میں نے امتیاز کو خط لکھا تو انھوں نے اس کا جواب نہ دیا۔ دوسرا خط لکھا تو اس کا جواب بہت دیر میں آیا۔ تب تک میں فیصلہ کر چکی تھی کہ اس شخص سے تعلقات منقطع کر لوں میں کچھ ایسی ہی ہوں جو فیصلہ کر لیتی ہوں اس پر فوراً عمل کرنے لگتی ہوں۔ امتیاز کے کئی خط آئے میں نے کسی کا جواب نہ دیا۔۔۔

"پطرس کو تو آپ جانتے ہی ہیں نا۔۔۔ امتیاز نے پطرس سے ذکر کیا۔ پطرس نے امتیاز کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا ڈراما انار کلی شائع کروائیں اور اسے حجاب کے نام معنون کر دیں۔۔۔۔

" امتیاز نے انار کلی کو شائع کیا اور اسے میرے نام معنون کر دیا مجھے کتاب ملی تو ساری رنجشیں ختم ہو گئیں۔ امتیاز کی زندگی میں ہی انار کلی کو

کلاسیک کا رتبہ دے دیا گیا تھا۔ اور یہ معمولی بات نہیں ۔۔۔۔۔ میں اس انتساب کے حوالے سے امتیاز کی ہمیشہ ممنون رہی۔

" اور پھر فاصلے مٹ گئے۔ سر محمد یعقوب نے میرے والد نواب اسماعیل سے امتیاز کے لیے میرا رشتہ مانگا۔ امتیاز بھی بلائے جا چکے تھے۔ مگر وہ ہمارے ہاں نہ ٹھہرے تھے۔ ایک ہوٹل میں رہائش پذیر تھے میرے والد نے ملازم سے نقشہ منگوایا اور اسے میز پر پھیلا کر کہا " یہ رشتہ نہیں ہو سکتا۔ کہاں لاہور۔۔۔ کہاں مدراس۔۔۔۔ فاصلہ بہت ہے۔ ۔۔۔ مگر فاصلوں کو تو مٹنا تھا۔ سر محمد یعقوب نے کہا کہ شمس العلماء ممتاز علی کو میں کیا جواب دوں گا۔۔۔ اور رشتہ ہو گیا۔۔۔ میں ایک دُنیا چھوڑ کر دوسری دُنیا میں چلی آئی۔ ایک تہذیب سے دُوسری تہذیب کی طرف سفر شروع ہوا۔ سر محمد یعقوب نے کہا تھا : "آپ اب جس علاقے میں جا رہی ہیں اس کی تہذیب اور رسم و رواج کو اپنے اندر رچا لیجئے گا۔"

عملی زندگی

شادی کے بعد تاج صاحب نے اپنی زندگی کو صرف ادب اور صحافت تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ سٹیج اور ڈرامے سے تعلق کے حوالے سے سٹیج کی جدید ہیئت یعنی فلم میں بھی دلچسپی لینا شروع کر دی۔ ۱۹۳۱ء میں ہنسو رائے نے انار کلی کے نام سے جو خاموش فلم بنائی تھی اس کی کہانی تو حکیم احمد شجاع نے لکھی تھی لیکن اس میں اکبر بادشاہ کا کردار سید امتیاز علی تاج نے ادا کیا تھا۔ سید ذوالفقار علی رضوی نے ویکلی مصور لاہور کے یکم مئی ۱۹۷۰ء کے شمارے میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس فلم میں سٹیٹ بنک آف پاکستان کے سابق گورنر شجاعت علی حسنی اور پطرس بخاری نے بھی ایک ایک پارٹ ادا کیا تھا۔ انہی کے بقول تاج صاحب نے اے آر کاردار کی فلم سوامی کے لیے کہانی لکھی پھر پنچولی فلم

آرٹ کمپنی کے لیے فلم "خاندان" کی کہانی قلمبند کی۔ خاندان ۱۹۴۲ء میں ریلز ہوئی۔ اس کے علاوہ تاج صاحب نے فلم پگڈنڈی، جھلکے اور خاموش کی کہانی اور مکالمے بھی نے تحریر کیے۔

قیام پاکستان کے بعد بھی سید امتیاز علی تاج فلمی دُنیا سے وابستہ رہے۔ اُنھوں نے فلم "چن وے" کی کہانی لکھی، فلم گلنار کی کہانی بھی لکھی اور اس کی ہدایت کاری کے فرائض بھی انجام دیئے۔ پاکستان کی دو فلمیں جو تاج صاحب کی کہانیوں کے سبب بے حد مشہور ہوئیں "انتظار" اور "زہر عشق" تھیں۔

قیام پاکستان کے بعد سید امتیاز علی تاج نے ریڈیو پاکستان کی بنیادیں مستحکم کرنے میں بھی بہت توجہ اور محنت کی۔ قیام پاکستان سے پہلے ریڈیو کے لیے تاج صاحب ڈرامے بھی لکھتے تھے اور صداکاری کے ذریعے مختلف کردار بھی ادا کرتے تھے لیکن پاکستان بننے کے بعد ان کی زیادہ تر توجہ قومی نوعیت کے پروگراموں کی طرف ہو گئی تھی۔ نقوش شخصیات نمبر میں جناب شوکت تھانوی نے ان واقعات کو شرح وبسط کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔

ریڈیو پاکستان سے وابستگی کے بارے میں سید امتیاز علی تاج نے ایک مرتبہ مرحوم شمیم احمد کو انٹرویو دیا تھا۔ اس کے حوالے سے شمیم احمد لکھتے ہیں:

" ریڈیو سے بھی ان کا تعلق بہت گہرا ہے قرطبہ کا قاضی ان کی ریڈیو کی تاریخ کا سنگ میل ہے۔ ابتدا میں جب ریڈیو کی باقاعدہ کوئی عمارت نہ تھی اور نہ وائی سی اے سے پروگرام نشر ہوتے تھے اس زمانے میں بھی انھوں نے کئی ڈرامے لکھے مگر ۱۹۴۷ء کے بعد ان کی ریڈیائی نشریات قومی جذبات میں بدل جاتی ہیں۔ ظفر الحسن نے ان سے کہا تھا کہ مہاجرین کی ہمت بڑھاؤ۔ چنانچہ یہی مضمون بعد میں ان کی تمام ریڈیائی تحریروں کا موضوع بن گیا۔ شوکت تھانوی کے ساتھ مل کر انھوں نے ایک جنون کے ساتھ کام کیا

اس زمانے میں جو پروگرام ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتا تھا اس کا نام تھا " پاکستان ہمارا ہے " اس پروگرام کے مقبول ہونے کا ثبوت اس سے ملتا ہے، کہ گاندھی جی نے بھی اس کا ذکر اپنی پرارتھنا میں کیا۔ راجہ غضنفر علی خان سے تعلقات کی بنا پر یہ پروگرام بنا۔ ایک پنجابی نے کہا افسوس تاج تقسیم ہو گیا۔ مس سارا بائی نے اس پروگرام کو سن کر کہا تھا کہ " میں اگر ریڈیو کا کوئی پروگرام سن کر روئی تو وہ یہی پروگرام تھا۔"

(قومی زبان کراچی، نومبر ۱۹۶۵ء)

بڑے بھائی سید حمید علی سے جائیداد کی تقسیم کے تنازعے، ریڈیو پاکستان سے قطع تعلق اور پنچولی فلم کمپنی کے ایک بھاری رقم دبا کر پاکستان چھوڑ جانے کے باعث ۱۹۵۶ء کے بعد سید امتیاز علی تاج مالی بحران کا شکار ہو گئے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ رئیس لاہور کے بیٹے، لاکھوں روپے کی جائیداد کے وارث اور سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والی شخصیت ہیں، انھیں مالی اعتبار سے کیا پریشانی ہو سکتی ہے؟ تاج صاحب بہت وضعدار اور خوددار انسان تھے۔ اس کے باوجود حالات ان کے قابو سے باہر ہو گئے۔ اس صورت حال کو انھوں نے لاہور میں محکمہ مالیات کے نام ایک عرضی میں ظاہر کیا۔ اس درخواست کا مسودہ مجھے ان کے کاغذات سے ملا تھا جسے محب گرامی سید قاسم محمود نے ماہنامہ کتاب کے " تاج نمبر" میں شائع کر دیا تھا۔ یہ درخواست تاج صاحب کی زندگی کے ایک خاص دور کی اہم دستاویز ہے۔ بے محل نہ ہو گا اگر اسے یہاں نقل کر دیا جائے :۔

مکرمی محترمی تسلیم!

میں کوٹھی نمبر ۴۰۔ ایبٹ روڈ لاہور مطابق نمبر ایس ۳۴۶ آر ر ۴۰ (آبادکاری) میں جس کے ہندو مالک ڈاکٹر ایم آر ساہنی تھے، رہتا ہوں۔ یہ کوٹھی میرے نام اس وجہ سے الاٹ ہوئی تھی کہ میں نے اپنی

۳ بہاولپور روڈ لاہور جس کے مالک لالہ کرم چند پوری تھے اور جس میں ۱۹۳۴ء سے رہتا تھا۔ محکمہ آبادی کاری کے حوالے کر دی تھی۔ اس تبادلہ کی ضرورت یوں پڑی تھی کہ میری ۳ بہاولپور روڈ لاہو کے برابر کی کوٹھی میں مسٹر ویربھان اسٹنٹ ڈائرکٹر انڈسٹریز رہتے تھے اور فسادات کے دوران ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو قتل کر دیئے گئے تھے میری بیوی اعصاب کی مریض ہیں۔ گیارہ سال پرانے ہمسائے کے قتل سے ان کے اعصاب پر بہت مضر اثر پڑا۔ ڈاکٹروں نے تاکید کی کہ ان کی صحت حال کرنے کے لیے نقل مکانی لازمی ہے، چنانچہ میں نے کوئی دوسرا مکان الاٹ کئے جانے کی درخواست دے دی۔ اس زمانے میں ڈپٹی کمشنر کی ہدایت کے مطابق میں نے ریڈیو پر "پاکستان ہمارا ہے" کے عنوان سے روزانہ آدھ گھنٹے کا پروگرام نشر کرنا شروع کیا تھا۔ یہ کام صبح آٹھ بجے سے رات کو دس بجے تک جاری رہتا۔ اسے سرانجام دینے میں سہولت ہم پہنچانے کے خیال سے مجھے ریڈیو سٹیشن کے قریب اس بنگلہ کا مکمل نصف حصہ دے دیا گیا۔

۱۹۴۹ء میں محکمہ آبادکاری نے مجھے یہ کوٹھی خالی کرنے کا نوٹس دیا لیکن جب اس کا مقدمہ ملک فتح خاں ڈپٹی کمشنر محکمہ آبادکاری کی عدالت میں پیش ہوا تو تمام تفصیلات معلوم ہونے کے بعد اُنھوں نے فیصلہ میرے حق میں کر دیا۔ اور ۳ بہاولپور روڈ کے معاوضے میں یہ کوٹھی مستقل طور سے میرے نام الاٹ ہو گئی۔

۳۔ بہاولپور روڈ کی کوٹھی جو بیس کنال میں اور بہت بڑی تھی میں اس کا کرایہ ایک سو دس روپے ماہوار ادا کرتا تھا۔ ۱۴۰ ایبٹ روڈ جو اس کے مقابلے میں نفیس تو ضرور ہے بہت چھوٹی اور صرف ۴ کنال زمین میں ہے اس کا کرایہ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار مقرر ہوا۔ اتنا زیادہ کرایہ ادا کرتا رہا۔

چنانچہ ۱۹۵۵ء کے آخر تک میں نے کرائے کے تقریباً آٹھ ہزار روپے ادا کیے۔

اس کے بعد میرا کاروبار بہت گر گیا۔ تقسیم ملک سے پہلے میں اپنے بڑے بھائی سید حمید علی کے ساتھ دارالاشاعت پنجاب لاہور کو چلاتا تھا۔ اس ادارے کے دو اخبار تھے: تہذیب نسواں،، اور پھول، جو ہزاروں کی تعداد میں چھپتے اور ہندوستان کے مختلف تعلیمی محکموں میں اور دوسرے حضرات کے ہاں جاتے تھے۔ اخباروں کی معرفت کتابوں کی فروخت بھی بہت زیادہ ہوتی تھی۔ ہماری کتابیں محکمہ تعلیم میں نصاب کے طور پر بھی پڑھائی جاتی تھیں لیکن تقسیم ملک کے بعد اخباروں کی اشاعت اتنی گری کہ مسلسل نقصان سے عاجز آکر تہذیب نسواں بند کر دینا پڑا۔ ذریعہ اشتہار نہ ہونے سے کتابوں کی فروخت بے حد گھٹ گئی تھی۔ ہماری نصاب کی اردو کتابیں اس لیے منسوخ ہوگئیں کہ محکمہ تعلیم نے اپنی کتابیں چھاپ لیں۔ ان حالات کو دیکھ کر میرے بڑے بھائی جان نے کاروبار مجھ سے تقسیم کر لیا۔ پھول اخبار وہ خود چلا رہے ہیں۔ مجھے صرف نصف کتابیں ملی ہیں۔ انھیں فروخت کرنے کے لیے میرے پاس نہ کوئی دکان ہے نہ اخبار ہے۔ دوسرے اخبارات میں اشتہار دینے کی شرح اُجرت اتنی زیادہ ہے کہ ادا کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ بنک کا قرضہ چڑھا ہوا ہے۔ جائداد پر بڑے بھائی کا قبضہ ہے۔ وہ نہ مجھ سے حساب کتاب کرتے ہیں۔ نہ کرائے میں سے میرا حصہ ادا کرتے ہیں۔ ان حالات نے پچھلے دو سال سے مجھے طرح طرح کی مشکلات میں گرفتار کر رکھا ہے اور ابھی کچھ معلوم نہیں کہ تمام فیصلہ طلب امور کا تصفیہ کب اور کیونکہ ہوگا۔ جب سے ان مالی مشکلات کا سامنا ہوا ہے میں کوٹھی کا کرایہ باقاعدہ گی سے ادا کرنے سے معذور رہا اور اسی سلسلے مین

یہ عرضی آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

میں اگرچہ ان معنوں میں مہاجر نہیں کہ پاکستان بننے کے بعد لاہور آیا ہوں لیکن ہم دونوں بھائیوں کی بہت بڑی جائیداد دیوبند (ضلع سہارنپور) میں تھی۔ وہاں ہمارے دو گاؤں، ایک باغ، ایک بہت بڑی زنانہ حویلی جو وہاں محل کہلاتی تھی اور ایک بڑا مردانہ مکان تھا۔ پاکستان بننے تک اس جائیداد کی آمدنی باقاعدہ آتی تھی اب وہ بھی بند ہے۔ جائیداد کے متعلق کلیم داخل کر دیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں پاکستان بننے سے پہلے میں نے دو سال سیٹھ دل سکھ پنچولی کی فلم کمپنی کی خدمات کی تھیں۔ وہ بوجوہ میری رقم ادا نہ کر سکے۔ چنانچہ انھوں نے مجھے ۵۴ ہزار کے پرونوٹ لکھ دیئے تھے۔ ان کے ہندوستان چلے جانے سے چون ہزار کی یہ رقم مجھے ملنے سے رہ گئی۔ میں نے کسٹوڈین کی عدالت میں اس رقم کا دعوے کر رکھا ہے کہ منظور ہوتے پر یہ رقم کم از کم درج رجسٹر تو ہو جائے۔

ان حالات میں آپ پر بخوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ تقسیم ملک کے بعد میں پے در پے کتنے شدید مالی نقصانات برداشت کر چکا ہوں۔ ان سب نقصانات کا خیال فرما کر اگر ازراہ نوازش مجھے اس طرح مہاجر قرار دے دیا جائے، جیسے بعض دوسرے حضرات اس قسم کے نقصان برداشت کر کے مہاجرین کہلا چکے ہیں تو میرے لیے کوٹھی کے کرائے میں تخفیف ہو جائے گی اور مجھ سے جس طرح بھی بن پڑے گا۔ میں اپنا کرائے کا حساب صاف کر دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری تمام مشکلات پر ہمدردانہ غور کر کے فیصلہ صادر فرمائیں گے اور مجھے دلی احسان مندی کا موقع بخشیں گے"۔

مجلس ترقی ادب کی نظامت :

مذکورہ بالا حالات نے سید امتیاز علی تاج کو مجبور کیا کہ وہ اپنے گزارے کے لیے مختلف وسیلوں کو آزمائیں۔ وہ ۵ جون ۱۹۵۴ء سے صوبائی حکومت کے علمی وادبی ادارے مجلس ترقی ادب کے رُکن نامزد ہو چکے تھے۔ ۱۵ جنوری ۱۹۶۰ء کو مجلس کے ایک اجلاس میں مجلس کے علمی کاموں کی نگرانی کے لیے معتمد کے ساتھ ایک نئی اسامی وجود میں لائی گئی جس پر سید امتیاز علی تاج کو ناظم یا ڈائریکٹر کے عہدے کی پیشکش کی گئی جو اُنھوں نے قبول کر لی۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو مجلس کی ہیئت حاکمہ کے اجلاس میں معتمد کی اسامی تخضیف میں آگئی تو تاج صاحب پر مجلس کے انتظامی اور علمی دونوں شعبوں کی ذمہ داری عائد ہو گئی۔

سید امتیاز علی تاج تادم زیست مجلس ترقی ادب کے ناظم رہے۔ تاج صاحب کے دس سالہ دور نظامت میں مجلس ترقی ادب سے دو سو کے قریب کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کی سنہ وار تعداد یوں بیان کی جا سکتی ہے :۔

۱۹۶۰ء۔ دس (۱۰)، ۱۹۶۱ء۔ بارہ (۱۲)، ۱۹۶۲ء۔ ستائیس (۲۷)
۱۹۶۳ء۔ بتیس (۳۲)، ۱۹۶۴ء۔ پندرہ (۱۵)، ۱۹۶۵ء۔ بیس (۲۰)
۱۹۶۶ء۔ بائیس (۲۲)، ۱۹۶۷ء۔ اٹھارہ (۱۸)، ۱۹۶۸ء۔ اٹھائیس (۲۸)
۱۹۶۹ء۔ تیرہ (۱۳) اور ۱۹۷۰ء۔ سات (۷)

مجلس ترقی ادب کی مطبوعات پر رائے دیتے ہوئے برصغیر کے ممتاز محقق مولانا امتیاز علی خاں عرشی رامپوری نے کہا تھا :

"مجلس ترقی ادب نے پچھلے چند برسوں میں جو کتابیں شائع کی ہیں ان کا انتخاب، ان کی ترتیب، ان کی طباعت، سب ہر لحاظ سے قابل ستایش اور لائق تقلید ہیں۔"

اسی طرح اردو ایک اور محقق اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ علوم

اسلامیہ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا:

" مجلس ترقی ادب نے مختلف موضوعات پر قدیم اور جدید مصنفین کی جو کتابیں شائع کی ہیں، ان سے وقت کی بہت اہم ضرورت پوری ہوتی ہے۔"

ا۔ اضافی ذمہ داریاں اور اعزازات:

ا۔ رکن مغربی پاکستان فلم سنسر بورڈ

۲۔ جنرل سیکرٹری: مغربی پاکستان آرٹس کونسل

۳۔ رُکن: مغربی پاکستان مجلس زبان دفتری

۴۔ رُکن: مغربی پنجاب پبلک لائبریری کمیٹی

۵۔ ممتحن برائے ایم۔ اے (اردو) و بی۔ اے برائے جامع کراچی وجامعہ پنجاب

۶۔ رُکن: سوشل ویلفیئر کونسل

۷۔ رُکن: بی۔ این۔ آر کونسل

۸۔ ستارہ امتیاز از حکومت پاکستان

۹۔ دس ہزار روپے کا صدارتی انعام، اور ڈرامے کی تحقیق پر۔

سید امتیاز علی تاج

شخصیت

سید امتیاز علی تاج کو میں نے پہلی مرتبہ قریب سے اس وقت دیکھا جب میں اسلامیہ کالج میں بی۔اے کے آخری سال میں تھا اور اپنی پڑھائی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے جناب خلیل الرحمٰن داؤدی کے ساتھ معاون کے طور پر کلاسیکی ادبی متون کی تدوین کا کام کرتا تھا۔ داؤدی صاحب کی ذات میرے علمی ذوق کی تربیت گاہ بھی تھی اور میری تعلیمی کفالت کا ایک وسیلہ بھی۔ جناب خلیل الرحمٰن داؤدی نے اللہ تعالیٰ اُنھیں عمر نوح عطا کرے جب میری علمی اور مالی اُمور میں سرپرستی کی ذمے داری لی تو کئی پہلوؤں سے میرے سرپرست ہوئے۔ اُنھوں نے ادبی تحقیق میں میرا ذوق دیکھ کر مجھے تصحیح متن کی طرف راغب کیا۔ خود ایک عظیم کتاب شناس ہونے کے سبب مجھے تحقیق کے بنیادی مآخذ سمجھائے۔ نسخہ شناسی اور متون خوانی کی مشق کرائی اور اس سے زیادہ یہ کہ میری عملی زندگی کے لیے ہمیشہ فکر مند رہے۔ وہ اپنے مقتدر حلقہ احباب میں سے ہر اس شخصیت سے میرا تعارف حوصلہ افزا مبالغے کے ساتھ کراتے جس سے اُمید ہوتی کہ وہ مجھے مادی زندگی میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے مدد دے سکتے ہیں۔

جناب خلیل الرحمٰن داؤدی کے قریبی احباب میں دو شخصیتیں اس وقت بے حد صاحب اثر اور ممتاز تھیں۔ ایک ہمہ صفت موصوف جناب ڈاکٹر ممتاز حسن جن کی علمی سرپرستی اور جوہر شناسی کا شہرہ ان دنوں پورے پاکستان میں تھا اور دوسرے سید امتیاز علی تاج جو داؤدی صاحب کی علمی وجاہت کے نہ صرف قدردان تھے بلکہ مجلس ترقی ادب

کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اُنھیں بہت بڑا سرمایہ سمجھتے تھے۔ تاج صاحب کے داؤدی صاحب سے بے حد ذاتی نوعیت کے مراسم بھی تھے۔ داؤدی صاحب مالی اور جائیداد وغیرہ کے مسائل میں تاج صاحب کو بہت صائب مشورے دیتے تھے اور تاج صاحب کو داؤدی صاحب کی ہر رائے پر مکمل اعتماد تھا۔

مجھے یاد ہے کہ میں ایک دوپہر داؤدی صاحب کے گھر بیٹھا کسی کلاسیکی متن پر ان سے مشورہ لے رہا تھا کہ اچانک تاج صاحب آگئے۔ جناب خلیل الرحمٰن داؤدی نے مجھے تاکید کی کہ جب تک تاج صاحب رہیں آپ نہ جایئے گا کیونکہ اس طرح سید امتیاز علی تاج جیسی عظیم ادبی شخصیت کا آپ کا بے تکلف ماحول میں تعارف ہو جائے گا۔ داؤدی صاحب اُنھیں دروازے تک لینے گئے۔ جب یہ دونوں بزرگوار اُوپر کی منزل پر کمرے میں داخل ہوئے تو میں نے داؤدی صاحب کے ساتھ ایک نہایت حسین و جمیل، سرخ و سفید اور صحیح معنوں میں بارُعب شخصیت کو کمرے میں آتے دیکھا۔ میں احترام میں کھڑا ہوا۔ داؤدی صاحب نے چند جملوں میں میرا تعارف اس طرح کرایا کہ "یہ گوہر نوشاہی ہیں، اسلامیہ کالج کے طالب علم ہیں، تحقیق کا شوق ہے اور ڈاکٹر وحید قریشی کے شاگرد ہیں۔" تاج صاحب نے ایک دل نواز مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دلنوازی ان کی شخصیت کا مستقل حصہ ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب داؤدی صاحب شربت اور پزیرائی کا سامان لینے دوسرے کمرے میں گئے تو تاج صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ داؤدی صاحب کی نگرانی میں نے کس قسم کا ادبی کام کر رہے ہیں۔ میں بتایا کہ داؤدی صاحب مجھ سے اُردو کے کلاسیکی متون تدوین کرا کر اس فن کے رموز و اسرار سے مجھے آگاہ کرتے ہیں۔ تاج صاحب نے پوچھا آپ نے اب تک کتنے متون ان کی نگرانی میں تیار کیے ہیں؟ میں نے کہا تین یا چار اور ان کے نام بتائے۔ اس پر تاج صاحب نے بے حد نرم اور رازدارانہ لہجے میں کہا: آپ مجلس ترقی کے لیے کوئی متن کیوں مرتب نہیں کرتے۔ ہم شائع کریں گے۔ اسی اثنا

میں داؤدی صاحب آگئے اور گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تاج صاحب تھوڑی دیر بیٹھے، داؤدی صاحب سے چند اُمور پر گفتگو کی اور تشریف لے گئے۔

تاج صاحب کے چلے جانے کے بعد میں نے اِن سے ہونے والی تمام گفتگو سے داؤدی کو آگاہ کر دیا۔ داؤدی صاحب ایک عالی ظرف اور شفیق انسان ہیں اس واقعہ سے اس قدر خوش ہوئے کہ جیسے کسی کی کوئی دیرینہ مراد بر آئی ہو۔ کہنے لگے یہی تو میں چاہتا تھا کہ سید امتیاز علی تاج اور آپ کے درمیان مکالمے کی کوئی براہ راست صورت پیدا ہو اور آپ کو مجلس ترقی ادب تک باعزت رسائی کا موقع ملے۔ آپ مجلس جاکر تاج صاحب سے ضرور ملیں۔ میں نے اس ملاقات کا ڈاکٹر وحید قریشی سے بھی ذکر کیا۔ انھوں نے بھی اس پر اظہار مسرت کرتے ہوئے اسے میرے مستقبل کے لیے نیک شگون قرار دیا اور اس سلسلے خود بھی تاج صاحب سے گفتگو کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کے چند روز بعد بی۔اے کے امتحانات شروع ہو گئے میں ان سے فارغ ہو کر مجلس گیا اور جب تاج صاحب سے ملا تو پہلے سے کہیں زیادہ اُنھیں مشفق اور دل نواز پایا۔ تاج صاحب اپنے سے کم عمر اور خاص طور پر تازہ واردان بساط ادب کی اس طرح حوصلہ افزائی کرتے تھے کہ ان میں خود اعتمادی اور ذہنی بلوغت پہلے سے کئی گنا بڑھ جاتی تھی۔ مجلس ترقی ادب میں اولین ملاقات پر ہی، تاج صاحب نے مجھ سے کہا: "ڈاکٹر وحید قریشی اور خلیل الرحمٰن داؤدی جیسے نامور صاحبانِ علم نے آپ کی علمی استعداد کو سراہا ہے اور میں نے اتنی تعریف کبھی کسی طالب علم کے بارے میں نہیں سنی۔ میری خواہش ہے آپ کسی اہم کلاسیکی متن کا انتخاب کر کے مجلس کے لیے اسے مرتب کریں اور مجھ سے رابطہ رکھیں تاکہ میں آپ کو مجلس کے لیے کام کے معیار اور تقاضوں سے آگاہ کر سکوں۔" تاج صاحب نے یہ بھی کہا کہ آپ جب چاہیں مجلس آسکتے ہیں اور جب چاہیں مجھ سے مل سکتے ہیں۔ اس دن کے بعد سید امتیاز علی تاج سے میری نیاز مندانہ دوستی کا سلسلہ جاری ہو گیا اور میں نے ڈاکٹر وحید قریشی اور جناب خلیل الرحمٰن داؤدی کے مشورے سے مظہر علی

ولا کی بیتال پچیسی کی تدوین میں ہاتھ ڈال دیا جو مجھ سے نو مشق کے لیے مشکل بھی تھی اور صبر آزما بھی۔ اس کام کو میں ایم۔اے اردو کی تیاری کے ساتھ ساتھ انجام دیتا رہا۔ تاج صاحب نے مجھے اس دوران تحقیق کی نسبتاً خشک ڈگر سے ہٹ کر انگریزی سے اردو تراجم کی طرف بھی راغب کیا۔ یہ ۱۹۶۴ء کے قریب کا زمانہ ہے میری اس سال کی ڈائری محفوظ ہے بے محل نہ ہوگا، اگر اس کے چند مندرجات یہاں نقل کر دیے جائیں۔

۱۲۔۲۔۶۴ء : تاج صاحب سے ترجے کا کام ملا ہے۔

1. India and its Native princes.
2. Life in western India.

سے اقتباس سات

۲۰فروری ۶۴ء : تاج صاحب کو کام مکمل کر کے دے دیا ہے۔ فل سکیپ کے سات صفحے بنے ہیں۔

۲۱ فروری ۶۴ء : تاج صاحب سے کام ملا ہے: Ride to Bombay کے بعض حصوں کا اردو میں خلاصہ کرنا ہے۔

۲۷فروری ۶۴ء : تاج صاحب سے کام ملا ہے، کتاب :

My recollections of Bombay کا پہلا باب

۲ امارچ ۶۴ء : تاج صاحب کو کام دے دیا ہے۔ چار صفحے۔

۲۳مارچ ۶۴ء : تاج صاحب سے ملاقات ہوئی انھیں Punjabi Sufi Poets دی ہے۔

۱۸مارچ ۶۴ء : تاج صاحب سے ملاقات ہوئی، پنجابی صوفی پوئٹس کے ترجے کا کام ڈاکٹر وحید قریشی سے مشورے کے بعد ملے گا۔

۲۱ مئی ۶۴ء : تاج صاحب سے شاخ زریں کا اشاریہ مرتب کرنے کا کام ملا

ہے۔

اس جگہ اس امر کی وضاحت بھی کر دوں کہ مجھے زمانہ طالب علمی میں کنواں کھود کر پانی پینا پڑتا تھا اور تعلیمی اور ذاتی اخراجات پورے کرنے کے لیے میرا واحد ذریع قلمی مزدوری تھی جس میں سید امتیاز علی تاج نے میری مختلف زاویوں سے مدد کی۔ مجلس ترقی ادب میں ان دنوں صحیفہ کے مدیر اور اردو ادب کے مایہ ناز محقق اور دانشور سید عابد علی عابد سے بھی مجھے سلسلہء نیاز مندی حاصل تھا۔ عابد صاحب مجھ سے صحیفے میں کتابوں پر تبصرے کراتے تھے اور ان پر اچھی ادائیگی ہوتی تھی۔

سید امتیاز علی تاج نے میری مدد معاش کا ایک اور سلسلہ یوں پیدا کیا کہ مجلس سے شائع ہونے والی ہر تازہ کتاب مجھے بھجواتے تھے اور ہدایت تھی کہ اسے پڑھ کر پروف خوانی کی اغلاط کی نشان دہی کر دوں۔ کتاب کا فی صفحہ پڑھنے کے دو آنے پڑھنے کے بعد غلطی نکالنے پر فی غلطی چار آنے الگ ملتے تھے اور شائع ہونے کے بعد کتاب کا ایک نسخہ مفت۔ اس طرح مجھے نہ صرف ایک اہم ادبی کتاب بلا قیمت مل جاتی تھی بلکہ ہر کتاب پر ایک اچھی مزدوری بھی میسر آجاتی تھی۔ یہ سلسلہ جاری رہا تاآنکہ تاج صاحب نے ۱۹۶۶ء میں مجھے مجلس ترقی ادب کی ملازمت میں لے لیا اور میرا عہدہ سید عابد علی عابد اور جناب کلب علی خاں فائق کے ساتھ مدیر کتب قرار پایا۔ سید عابد علی عابد کو علالت کے باعث مجلس نے گھر بیٹھ کر کام کرنے کی اجازت دے دی تھی اور ان کا کمرہ سامانِ تحریر اور فرائض کار مجھے سونپ دیے گئے۔

اب میرا سید امتیاز علی تاج سے ہمہ وقتی تعلق پیدا ہو گیا تھا اور تاج صاحب ایک قابل احترام شخصیت کے ساتھ ساتھ ایک افسر کی حیثیت سے بھی میری زندگی میں داخل ہو گئے تھے۔ مجلس ترقی ادب میں آکر مجھے معلوم ہوا کہ سید امتیاز علی تاج اردو کے کلاسیکی ڈراموں کا ایک سلسلہ مرتب کر رہے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ میں دیگر علمی فرائض کے ساتھ ساتھ اردو ڈراموں کی تدوین میں بھی ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ اس کام کی

ہلکی سی جھلک آئندہ اوراق میں علیحدہ عنوان کے تحت پیش کی جائے گی اس جگہ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تاج صاحب کے ساتھ یہ تعلق ان کے آخری دم تک قائم رہا اور اس دوران تاج صاحب کی شخصیت کے بے شمار پہلو دیکھنے کا موقع ملا۔

سید امتیاز علی تاج کی شخصیت ایک تراشیدہ ہیرے کی طرح تھی جس کے متعدد پہلو ہوتے ہیں لیکن ہر پہلو اتنا شفاف، اتنا تابناک کہ دوسری ہر شے ء کو اس کے معیار پر پرکھا جاتا ہے۔ تاج صاحب کی ہمکاری میں میں نے تقریباً پانچ سال کام کیا۔ اس سارے عرصے میں میں نے تاج صاحب کو کبھی افسر کی حیثیت سے نہیں دیکھا۔ افسر اور کسی ادارے کا سربراہ کیا ہوتا ہے اس کا مفہوم صرف وہی سمجھ سکتا ہے جس نے سید امتیاز علی تاج جیسی شخصیت کے ساتھ کام کیا ہو۔ تاج صاحب کی لغات میں ادارہ ایک کنبہ یا خاندان ہوتا ہے جس کا ہر فرد باہم کس رشتے کے تحت جڑا ہوا ہوتا ہے اور ادارے کا سربراہ ایک باپ ہوتا ہے جو اولاد اور خاندان کے ہر فرد کو اپنے دل کی دھڑکنوں میں محسوس کرتا ہے۔

مجلس ترقی ادب میں تاج صاحب کے ماتحت اور ہم کاران سے ڈرتے نہیں تھے، ان سے پیار کرتے تھے۔ ان کا احترام کرتے تھے۔ تاج صاحب کے والد مولوی سید ممتاز علی تو دوسروں سے ایک خاص فاصلے پر رکھ رکھاؤ سے ملنے والے بزرگ تھے معلوم نہیں تاج صاحب نے زندگی کا یہ اسلوب کہاں سے حاصل کیا تھا؟ مجھے یاد ہے جب ۱۹۶۹ء میں ڈاکٹروں نے انھیں کچھ دن گھر میں رہ کر مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا اور تاج صاحب مجلس کی ضروری مسلیں مجھ سے گھر پر لانے کے لیے کہتے تھے، دفتر کا ماحول کس قدر سنسان دکھائی دیتا تھا۔ جب میں تاج صاحب کے گھر سے واپس دفتر جاتا تو سب لوگ آبدیدہ ہو کر ایک ہی سوال کرتے : تاج صاحب دفتر کب آرہے ہیں؟ مجھے یاد ہے کہ ایک روز ہمارا ایک ساتھی منیر جو آج بھی مجلس کے شعبہ فروخت مطبوعات سے وابستہ ہے بے حد اداسی کے عالم میں باہر کھڑا صدر دروازے پر ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔

میں نے پوچھا: منیر خیریت ہے اتنے بے چین ہو۔ اس پر اُس نے بڑے دردناک لہجے میں کہا کئی دن سے تاج صاحب کو نہیں دیکھا دل چاہتا ہے ابھی ان کی گاڑی صدر دروازے سے داخل ہو جائے۔ تاج صاحب واقعی مجلس کو اپنا گھر اور رفقائے کار کو اپنا خاندان سمجھتے تھے۔

ایک روز مجھے بلایا اور کہا کہ مولانا! (تاج صاحب یہ لفظ بہت پیار سے سب کے لیے استعمال کرتے تھے) رام پال بیمار ہے ذرا اس کی طرف چلتے ہیں۔ میں نے حیرت سے پوچھا: سید صاحب رام پال جمعدار کے ہاں؟ مسکرا کر کہنے لگے ہاں بھئی اس کو کئی روز سے خلو ہے اس کے کوارٹر میں جا کر اس کی احوال پرسی کرنی چاہیے۔ چنانچہ میں اور تاج صاحب رام پال کے کوارٹر میں گئے۔ رام پال کو تاج صاحب کے آنے کی اطلاع نہیں دی گئی تھی، حد درجہ غلیظ ماحول میں وہ میلے کچیلے بستر پر پڑا تھا۔ تاج صاحب کو دیکھ کر ایسے کھڑا ہوا جیسے اس کے روئیں روئیں میں نئی طاقت آگئی ہو۔ تاج صاحب اس کے کمرے میں بچھی ہوئی دوسری چارپائی پر اطمینان سے بیٹھ گئے اور مجھے بھی اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ رام پال کی احوال پرسی کے بعد تاج صاحب نے اسے ایک سو روپیہ دیا اور کہا کہ اس سے ضروری دوائیوں کے علاوہ نیا بستر بنوائے۔ یاد رہے کہ ۱۹۶۸ء میں گریڈ ۱۷ کے افسر کی تنخواہ ساڑھے تین سو روپے ماہوار تھی اور رام پال کو چالیس روپے ماہوار سے زیادہ نہیں ملتے تھے۔ جب تک رام پال بالکل تندرست ہو کر ڈیوٹی پر نہ آیا تاج صاحب ہر روز اس کے گھر آدمی بھیج کر اس کی خیریت معلوم کرتے رہے۔

ساتھیوں سے کام لینے کا طریقہ یہ تھا کہ انتظامی اُمور سے تعلق رکھنے والے عملے کے لیے تو وقت کی پابندی ضروری تھی علمی شعبے کے لیے ضروری نہ تھی۔ تاج صاحب مدیران کتب کو چوبیس گھنٹے کا ملازم سمجھتے تھے اور ان کے احساس ذمہ داری میں کبھی مداخلت نہیں کرتے تھے۔ تاج صاحب کا خیال تھا کہ تصنیف و تالیف سے وابستہ

افراد علمی اور ادبی کام اپنے لیے کرتے ہیں مجلس محض ان کے لیے ایک ناشر کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ مجلس کے علمی شعبے میں جناب کلب علی خاں خائق رام پوری اور میں، صرف دو افراد شامل تھے۔ تاج صاحب ہم سے صرف یہ سوال کرتے تھے کہ آپ کون کون سی کتاب مرتبہ کر رہے ہیں۔ یہ کام کتنے عرصے میں مکمل ہوگا، کیسے مکمل ہوگا، تاج صاحب کی زبان پر یہ سوالات کبھی نہیں آتے تھے۔ مجلس ترقی ادب میں کلاسیکی متون کی تدوین اور ان پر علمی کام کا جو معیار تاج صاحب نے قائم کیا اس کی مثال بر صغیر کے کسی ادارے میں نہ اس وقت موجود تھی اور نہ ان کے بعد تا دیر نظر آئی۔

مجلس ترقی ادب کے علمی شعبے سے وابستہ ارکان تاج صاحب کی نظر میں بڑا اہم درجہ رکھتے تھے۔ کسی مسودے پر علمی شعبے کا کوئی رکن اگر رائے دے دیتا تو تاج صاحب اس کو اس قدر اہمیت دیے کہ مجلس سے باہر بڑے سے بڑے محقق کی رائے کو بھی اس پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے ایک مقالے پر سید عابد علی عابد کی رائے اور حضرت جوش ملیح آبادی کی کتاب "یادوں کی بارات" کے مسودے پر راقم الحروف کی رائے اس سلسلے کی اہم مثالیں ہیں یہ دونوں کتابیں اس وقت مجلس سے شائع نہیں ہو سکی تھیں۔

سید امتیاز علی تاج کسی سے پرخاش نہیں رکھتے تھے۔ وہ نہ کسی کے بارے میں توہین آمیز کلمہ استعمال کرتے تھے اور نہ کسی کا اپنے بارے میں کوئی نازیبا حرف برداشت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ چند اخبارات میں تاج صاحب کا حوالہ دے کر مجلس ترقی ادب کے خلاف کسی نے کچھ لکھوا دیا تھا۔ تاج صاحب نے پریس کانفرنس کی اور صحافتوں سے مخاطب ہو کر بڑے جذباتی انداز میں کہا:

"اردو ادب کی ترویج اور فروغ علوم کے سلسلے میں میری اور میرے خاندان کی خدمات آپ سب پر واضح ہیں، میرے خلاف آئندہ کسی اخبار میں اگر کوئی ایک لفظ بھی شائع ہوا تو میں بطور احتجاج مجلس ترقی ادب سے تو کیا تمام قومی اداروں کی خدمت سے اپنے آپ کو الگ کر لوں گا۔ اگر قوم کو میری ضرورت نہیں تو مجھے بھی کسی کے ہاتھ میں اپنی عزت دینے کا شوق نہیں۔"

تاج صاحب نے اس کے بعد مجلس کی کارگزاری کی تفصیلات بیان کیں۔ پریس کانفرنس کے آخر میں کوئی صحافی ایسا نہ تھا جس نے تاج صاحب سے معذرت نہ کی ہو۔ یہ تاج صاحب کی علمی اور بزرگانہ عظمت کی ایک واضح دلیل تھی۔

سید امتیاز علی تاج بے حد خوش گفتار اور سلیقے سے گفتگو کرنے والے انسان تھے۔ کسی سے بات کرتے ہوئے کبھی جذباتی نہیں ہوتے تھے۔ وہ ٹھنڈے دل اور ٹھنڈے دماغ سے مسکرا کر بات کرتے تھے۔ لہجے میں حد درجہ نرمی اور متانت ہوتی تھی۔ وفات سے کئی سال پہلے اُنھیں نہ جانے کیوں یہ احساس ہو گیا تھا کہ عمر کے ساتھ ساتھ اُن کے مزاج میں تبدیلی آسکتی ہے چنانچہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں نفسیات کے اُستاد، پروفیسر مظفر حسین قریشی کے ہاں سال میں ایک دو مرتبہ تجزیہ نفسی کے لیے جاتے تھے۔ جب نشست ختم ہوتیں تو وہ پہلے سے زیادہ چاق و چوبند، ہشاش بشاش اور تازہ توانا نظر آتے تھے۔

تاج صاحب خوش لباس اور خوش وضع شخصیت تھے۔ گھر میں کُرتا اور کھلے پائنچے کا پاجامہ پہنتے لیکن گھر سے باہر گرمیوں میں پتلون قمیض اور سفاری سوٹ اور سردیوں میں کوٹ پتلون پہنتے تھے۔ لباس کے رنگ ان کی شخصیت کی طرح خوش گوار اور پُر سکون ہوتے تھے۔ سرخ و سفید ہونے کے ساتھ ساتھ چونکہ آخر تک ستواں جسم رہے اس لیے ہر لباس اُنھیں اس قدر زیب دیتا تھا کہ ان کے ہم عمر ان پر رشک کرتے تھے۔ ستر سال کی عمر میں بھی اُنھوں نے بڑھاپے کو اپنے اُوپر طاری نہیں کیا تھا۔

تاج صاحب کہتے تھے "بڑھاپا ایک بیماری ہے جو لڑکپن کے بعد صحت سے لاپرواہی کے باعث انسان کو لاحق ہو جاتی ہے۔ احتیاط کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ، لاپرواہ لوگوں کے مقابلے میں لمبی عمر عطا کرتا ہے۔"

سید امتیاز علی تاج اکثر اردو بولتے تھے کیونکہ اردو گفتار گھرانے یعنی اہل سہارنپور سے تعلق رکھتے تھے لیکن پنجابی زبان وادب سے اُنھیں عشق کی حد تک پیار تھا۔ وہ بچپن سے جوانی تک دارالاشاعت پنجاب میں رہے جو قدیم لاہور کی دیوار کے نزدیک ہونے کے باعث پنجاب کا ایک مخصوص کلچر لیے ہوئے تھا۔ تاج صاحب کو روانی مہارت اور مخصوص لہجے کے ساتھ پنجابی بولتے سننے والا آدمی دنگ رہ جاتا تھا کہ کیا یہ ہی حضرت ہیں جو تھوڑی دیر پہلے خالص یو۔پی۔ کے لہجے میں اردو بول رہے تھے۔ تاج صاحب کے بچپن کا دوست خلیفہ جلد ساز جب کبھی مجلس میں ان سے ملنے آتا تو دونوں کی پنجابی گفتگو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہوا کرتی تھی۔ ایک دن یہ دونوں بیٹھے تھے، میں کسی کام سے تاج صاحب کے کمرے میں اچانک چلا گیا تو وہ خلیفہ سے کہہ رہے تھے " اوئے بھڈ خلیفہ جاننا تینوں۔" میرے کمرے میں داخلے پر تاج صاحب نے مسکرا کر جملے بدل لیے ورنہ معلوم نہیں وہ بے تکلفی میں خلیفہ سے کیا کہہ رہے ہوتے۔ خلیفہ بھی تاج صاحب کو صرف "تاج" ہی کہا کرتا تھا۔

تاج صاحب اپنے ملنے والے کی تالیف قلوب والہانہ انداز میں دل کی گہرائیوں سے کرتے تھے۔ دور دراز سے لوگ اُنھیں اپنے ذہنی مسائل لکھ کر بھیجتے۔ میرے پاس تاج صاحب کے نام آیا ہوا کسی کا ایک خط محفوظ ہے اسے آپ کی خدمت میں بطور نمونہ پیش کرنے کو دل چاہتا ہے چنانچہ حرف بہ حرف نقل کرتا ہوں:۔

۴۸۶ SHADIWAL

26-07-65 عظیم المرتبت سید صاحب

السلام علیکم!

مزاجِ اقدس!

آپکا نوازش نامہ مورخہ ۶۵۔۷۔۲۶ کا ملا۔ جس کے لیے شکریہ قبول فرمائیں۔

۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا کہ ایک دوست کے ہاں سے "پھول" کی فائلیں مطالعہ کیلئے دستیاب ہوئیں۔ وہیں سے میں آپ سے متعارف ہوا۔ اسکے بعد گزشتہ ۳۰/۲۹ برسوں میں مجھے آپ کے ساتھ محبت اور عقیدت کا ایک مستقل غائبانہ تعلق رہا ہے۔

آپ اُس بڑے ممتاز اور فیض رساں خاندان کے چشم و چراغ ہیں، بقول شوکت تھانوی مرحوم "جسکی شرافت کی قسم کھائی جا سکتی ہے" اور جو تقریباً ایک صدی سے ایک دُنیا کو تہذیب، شائستگی اور آداب معاشرت کا درس دے رہا ہے۔ جس کا اپنا چپہ چپہ ادیب اور دانشور ہے۔ اور جس کے گہوارہ تربیت میں ہمارے چوٹی کے صحافیوں شاعروں، ادیبوں اور افسانہ نگاروں کی بہت بڑی تعداد پروان چڑھی ہے۔

اور آپ خود ایک بڑے کامیاب ناشر، بڑے نیک نام فلم ساز اور فنون لطیفہ کے بہت بڑے مربی۔ برصغیر پاک وہند کے سب سے بڑے ڈراما نگار۔ دبستان لاہور کے سب سے پُرانے صحافی۔ ۱؎ اور علامہ نیاز فتحپوری کے الفاظ میں "نہایت اچھے ادیب" ہیں۔

۱؎ زندہ اکابر میں سے میاں بشیر احمد صاحب کا "ہمایوں" اور حکیم احمد شجاع صاحب کا "ہزار داستان" آپ کے "کہکشان" کے بہت بعد منصئہ شہود پر آئے۔ اور مولانا غلام رسول مہر صاحب بھی آپ سے بڑی دیر بعد باقاعدہ طور پر کوچہء صحافت میں وارد ہوئے۔

چنانچہ آپ ایسی رفیع الشان ہستی کا خط ملنے سے جو خوشی مجھے ہوئی ہے۔ وہ بے پایاں ہے۔

آپ کے حکم کے مطابق میں انشاء اللہ پروفیسر مظفر قریشی صاحب سے ملوں گا۔ اور ان کے اخراجات (بشرطیکہ وہ میری استطاعت سے بہت زیادہ نہ ہوئے) ادا کر کے اپنا تجزیہء نفس ضرور کراؤں گا۔

مجھے آپ کی شدید مصروفیات کا غولی احساس ہے۔ لیکن چونکہ میری اُلجھنیں ذاتی ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی، تاریخی، سیاسی اور ملی نقطہ نظر سے بھی قابل غور ہیں۔ اس لئے میں آپ سے، جو ہمارے ارباب فکر و نظر اور ثقافتی راہنماؤں میں بڑا امتیازی مقام رکھتے ہیں، اور جن کی نگاہ شخصی اور قومی نفسیات پر بہت وسیع اور گہری ہے اور جن کے مشفقانہ مشورے سے میں (جو ازل سے ایک دُکھیا روح لے کر آیا ہوں اور ایک سید صاحب کا ہی "فریب خوردہ" ہوں اور اب ہر طرف سے ناامید ہو چکا ہوں)۔ تجزیہ نفس کی راہ پر آیا ہوں۔ دردمندانہ درخواست کرتا ہوں کہ :۔

"آپ میرے معاملے میں ذاتی دل چسپی لیں اور میرے نفسیاتی تجزیہ میں پروفیسر مظفر قریشی صاحب کی مدد کریں۔ اُمید ہے کہ اس صورت میں نسبتاً آسانی سے اور جلد موجودہ کرب ناک صورت حالات سے نجات حاصل کر لوں گا۔"

چنانچہ اس غرض سے میں پانچ تحریروں کی نقلیں آپ کی خدمت عالیہ میں ارسال کر رہا ہوں۔ جن کے مطالعہ سے آپ میری سب مشکلات اور پریشانیوں سے واقف ہو جائیں گے۔ آپ ازراہ کرم، ان کے مطالعہ کے بعد یہ تحریریں پروفیسر قریشی صاحب کو پہنچا دیں اور اُن سے وقت مقرر کر کے مجھے اطلاع دیں تاکہ میں آپ سے اور قریشی صاحب سے براہ راست گفتگو اور باقاعدہ علاج کے لئے حاضر ہو جاؤں۔

جیسا کہ ان تحریروں سے آپ کو معلوم ہو جائیگا۔ میرے گھر میں دو ہی مرد

ہیں۔ والد صاحب اور میں۔ والد صاحب بوجہ ہماری خانگی معاملات میں ایکٹوپارٹ لینے سے قاصر ہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ گھر کی مختاری اور ذمہ داری کا بوجھ مجھ پر ہی ہے۔ اور اس لئے بلاشبہ سارے گھر کی آسودگی، فارغ البالی اور ترقی کا انحصار میری ذہنی اور جسمانی صحت پر ہے۔ اور جب تک میں ذہنی اعتبار سے مریض ہوں، جسمانی لحاظ سے میرے تندرست ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

ہو سکتا ہے کہ آپ کی اور پروفیسر مظفر قریشی صاحب کی مشفقہ توجہ سے جو میرا نفسیاتی تجزیہ ہو، اس سے میری وہ صلاحیتیں جو حضور عالیؒ کے فیضان سے ایک بار جاگ اُٹھی تھیں۔ پھر بیدار ہو جائیں، اور میں عالم اسلام کی بہت بڑی خدمات انجام دے سکوں۔ اور اگر خدانخواستہ یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اپنے مختصر کنبے میں عزت و وقار کے ساتھ زندگی کے باقی ایام توبسر کر سکوں۔

حضور عالیؒ کی رسی میری گردن میں پڑ چکی ہے اور اُنھوں نے مجھے اپنے فتراک میں باندھ رکھا ہے۔ اُن کے وعدوں کو جھوٹا ماننے پر جی آمادہ نہیں ہوتا۔ اُن کے وعدوں کا تجزیہ ہی دراصل یہ نفسیاتی تجزیہ ہوگا۔ جیسا کہ آپ نے اپنے مضمون "کامیاب زندگی کا تصور" میں تحریر فرمایا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے میں پاگل نہیں ہوں بلکہ محض ایک اعصابی ہوں۔ یوں بھی آپ عمر میں میرے والد صاحب کے برابر ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے لئے اپنے کچھ قیمتی وقت کی قربانی ضرور دیں گے اور عنداللہ ماجور ہوں گے۔

مرسلہ تحریروں کی تفصیل یہ ہے :۔

i. مضمون "نومبر میں پیدا ہونے والوں سے ملئے" منقولہ از ماہ نامہ "ہمدرد صحت" کراچی بابت ماہ نومبر ۱۹۵۳ء

ii. درخواست نما تحریر جو میں نے ۲۶۔۰۵۔۶۲ء کو اپنے پیر و مرشد حضرت سید افضال احمدؒ صاحب گیلانی ۔ سجادہ نشین ، منڈیر سیداں، ضلع سیالکوٹ کی خدمت میں خود حاضر ہو کر پیش کی تھی۔

خط جو میں نے ۱۰۔۹۔۶۴ء کو جناب عرفان چغتائی (مرحوم) ایڈیشن انچارج روز نامہ نوائے وقت "لاہور کو بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ .A.D روانہ کیا تھا۔

خط جو میں نے ۱۔۱۱۔۶۴ کو حکیم آفتاب احمد صاحب قرشی ایم اے خلف الرشید شفاء الملک حکیم محمد حسن صاحب قرشی۔ ہیڈن روڈ لاہور کو لکھا تھا۔

عریضہ جو ۲۹۔۳۔۶۵ کو میں نے سیدی و مولائی حضرت سید افضال احمدؒ صاحب گیلانی کو بذریعہ رجسٹری ارسال کیا تھا۔

اپنی تحریروں میں زباندانی کی غلطیوں کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

نوٹ :۔ مرسلہ تحریریں صرف میرے ذاتی واردات اور محسوسات کا آئینہ ہیں اور میں انہیں مجبوراً اپنے تجزیہ نفس کے لیے روانہ کرا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں ہے۔

جواب کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔

والسلام

نیاز کیش

عنایت اللہ

معرفت ایم اللہ دتا احمدؒ دین ریلوے روڈ گجرات

ادبی خدمات کا مختصر خاکہ

سید امتیاز علی تاج کی زندگی میں اردو کے نامور محقق آنجہانی مالک رام نے ان سے فرمائش کی کہ اپنی ادبی خدمات کا ایک مختصر خاکہ مرتب کرکے ارسال فرمائیں، تاج صاحب کے لیے یہ خاکہ میں نے لکھا جو اُنھوں نے جناب مالک رام کو ارسال فرمایا۔ چونکہ یہ تحریر تاج صاحب کے ایما پر لکھی گئی، تکرار مطالب کے باوجود اسے بطور یادگار قارئین کی نذر کیا جاتا ہے:

۱۔ عورتوں کا مشہور ہفتہ وار اخبار تہذیب نسواں ۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۱ء تک مرتب کرتے رہے۔

۲۔ بچوں کے مشہور اخبار "پھول" کے مدیر رہے۔ جس نے قریباً نصف صدی تک بچوں کی ذہنی تربیت میں نمایاں اور اہم کردار ادا کیا۔

۳۔ ۱۹۱۸ء میں مشہور ادبی جریدے "کہکشاں" کو مرتب کیا جس کے قلمی معاونین میں اردو کے متعدد معروف شاعر اور صف اول کے ادیب تھے۔

۴۔ عورتوں اور بچوں کے لیے ایک سو کے قریب کتابیں لکھیں۔ یہ کتابیں نہ صرف محکمہ تعلیم نے بچوں کے مفید اور معاون نصاب میں شامل کیں بلکہ انھیں "بے مثال مطالعاتی ادب" قرار دیا گیا۔

۵۔ انار کلی ۔۔ مشہور و معروف اُردو ڈراما ۱۹۲۵ء میں دار الاشاعت پنجاب لاہور سے شائع کیا۔ اس کتاب کو جن نامور نقادوں اور اکابرین ادب نے خراج تحسین پیش کیا۔ ان میں ڈاکٹر سر محمد اقبال، پروفیسر مرزا محمد سعید، پطرس بخاری اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے نام قابل ذکر ہیں۔ محکمہ تعلیم پنجاب نے مصنف کو اس پر انعام دیا اور کتاب کو بی اے، ایم اے اور مشرقی علوم کے امتحانات کے نصاب میں شامل کیا۔ اس ڈرامے کو بے شمار شوقیہ کھیل کرنے والوں کی منڈلیاں سٹیج بھی کر چکی ہیں۔

۶۔ چچا چھکن ۔۔ مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ ۔۔ مطبوعہ دارالاشاعت پنجاب لاہور

۷۔ متعدد کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیں

۸۔ پروفیسر پطرس بخاری کے ساتھ مل کر مندرجہ ذیل کھیلوں کو ترجمہ اور سٹیج کیا:

i. برنارڈ شا Arms and Man

ii. کیرل چپیک R.U.R.

iii. ان کے علاوہ متعدد ایک ایکٹ کے کھیل

۹۔ قرطبہ کا قاضی اور دوسرے امریکی اور یورپی ڈراموں کے تراجم

۱۰۔ محکمہ تعلیم کے اسکولوں کے لیے اردو کا نصاب تیار کیا۔

۱۱۔ شاہکار تصاویر ۔۔ اردو میں مصوری پر معیاری کتاب

i. شیکسپئر : اے مڈ سمر نائٹ ڈریم

A Mid Summer Night Dream

ii. لارڈلٹن :Laila or Siege of Granade اس کتاب کا ترجمہ سب سے پہلے سر سید مرحوم کے صاجزادے جسٹس محمود نے "تہذیب الاخلاق" کے لیے شروع کیا لیکن چند قسطوں کے بعد یہ لکھ کر سلسلہ ختم کر دیا کہ اس کتاب کو اردو میں منتقل کرنا ممکن نہیں۔

iii. مورس لیواں :Grand Guignol Stories

iv. سین جان ہمکر :Two Mr. Wetherhys

v. ایڈگر ایلین پو، آسکر وائیلڈ اور فرانس کے متعدد دوسرے ادیبوں کی مختصر کہانیاں۔

۱۲۔ اردو کے کلاسیکی ڈراموں کی ترتیب و تدوین۔

اُردو ادب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ آردو کے کلاسیکی ڈراموں کو ادبی حیثیت سے تصحیح متن، حواشی اور تنقیدی تبصروں کے ساتھ مرتب کیا ہے، اس سلسلے کی کم و بیش تیس جلدیں ہوں گی۔ جن میں سو سے زاید ڈرامے شامل ہیں، یہ سلسلہ مجلس ترقی ادب "لاہور سے شائع ہو رہا ہے متقدمین کی سات جلدیں چھپ چکی ہیں۔ باقی زیر اشاعت ہیں۔ جو جلدیں آچکی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے :۔

۱۔ بمبئی میں اُردو کا پہلا ڈراما۔ خورشید مع اردو ڈرامے کا تاریخی جائزہ۔

۲۔ آرام کے ڈرامے (حصہ اول)

۳۔ آرام کے ڈرامے (حصہ دوم)

۴۔ ظریف کے ڈرامے

۵۔ رونق کے ڈارامے (حصہ اول)

۶۔ رونق کے ڈرامے (حصہ دوم)

۷۔ حباب کے ڈرامے

سید صاحب مندرجہ ذیل عہدوں پر فائز رہے :

۱۔ رُکن ویسٹ پاکستان فلم بورڈ

۲۔ جنرل سیکرٹری ویسٹ پاکستان آرٹ کونسل

۳۔ رُکن مجلس زبان دفتری، مغربی پاکستان

۴۔ رُکن مجلس ترقی ادب، لاہور

۵۔ رُکن لائبریری کمیٹی، پنجاب پبلک لائبریری لاہور

۶۔ ممتحن ایم۔اے (اُردو) بی اے، پنجاب یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی

۷۔ رُکن سوشل ویلفیئر کونسل

۸۔ رُکن بی۔این۔آر۔لاہور

حکومت پاکستان نے سید صاحب کی ادبی اور قومی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُنھیں ستارہ امتیاز اور اعلیٰ ادبی کارکردگی کے تمغے اور انعامات پیش کیے ہیں۔ سید صاحب گزشتہ دس برس سے مجلس ترقی ادب لاہور میں ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ آپ کی نگرانی اور سرکردگی میں مجلس کی طرف سے جو علمی ادبی اور تحقیقی کام ہوا ہے، اس کی تعداد اور معیار دونوں اعتبار سے اُردو ادب کی اشاعتی تاریخ میں مثال ملنا مشکل ہے۔

اُردو کلاسیکی ڈراموں کا منصوبہ

سید امتیاز علی تاج نے مجلس ترقی ادب کے سامنے ۱۰ مئی ۱۹۵۷ء کو اُردو کلاسیکی ڈراموں کی تدوین کا منصوبہ پیش کیا جو مجلس کے اجلاس منعقدہ ۱۳ مئی ۱۹۵۷ء

میں منظور کر لیا گیا۔ تاج صاحب کب سے اس منصوبے پر کام کر رہے تھے اس کا صحیح تعیّن نہیں کیا جا سکتا البتہ ۱۹۵۷ء میں جب مجلس کی طرف سے ان کے منصوبے کی منظوری ہو گئی تو اُنھوں نے ڈراموں کے کلاسیکی متون کی فراہمی اور جمع آوری کا کام تیز کر دیا۔ اس سلسلے میں برصغیر کے مختلف شہروں کے تاجران کتب اور قدیم کتب فروشوں کے پتے فراہم کیے گئے اور بے شمار حضرات کو خطوط روانہ ہوئے۔ تاج صاحب کی ایک کیلنڈر ڈائری میرے پاس ہے جس کے اوراق کی تہہ میں تاج صاحب کے نام آئے ہوئے کچھ خطوط رکھے ہیں۔ ان میں سے دو یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

۲۳-۵-۱۹۵۷ء

احمد آباد

عزیزی امتیاز

اسلام علیکم !

آپ کا مکتوب ملا تھا، چونکہ مجھے بمبئی جانا تھا اس لیے حسب ارشاد اپنے ایک دوست حسن الدین صاحب کو جو کتب فروش اور ناشر بھی ہیں آپ سے براہ راست خط و کتابت کر کے جس قدر بھی ان سے ہو سکے، ڈراموں کے متعلق معلومات اور مواد فراہم کر کے آپ تک پہنچانے کا کام سپرد کر دیا تھا چنانچہ واپسی پر معلوم ہوا کہ اُنھوں نے میری حسب منشا خط بھی لکھا اور کچھ ڈرامے بھی ارسالِ خدمت کیے مگر رسید نہیں ملی۔ مجھے اُمید قوی ہے کہ حسن الدین صاحب آپ کے پیش نظر مقاصد میں کماحقہ ہاتھ بٹائیں گے۔ بلکہ سید ابو ظفر ندوی جو عرصہ دراز سے یہاں مقیم ہیں اور گجرات کی تاریخ بھی لکھی ہے ان سے بھی بہت کچھ کام لے سکیں گے۔ اس وقت وطن تشریف لے گئے ہیں ورنہ میں بذات خود بھی اِن سے مل کر تمام باتیں طے کر دیتا۔ انشاء اللہ چند روز میں ان کی واپسی ہو گی تو میں حسن الدین صاحب کی معیت میں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض حال کر دوں گا اور تعاون حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔

پرتھوی راج کے چند ڈرامے جو بمبئی میں سٹیج کیے گئے ہیں۔ مجھے عرصہ قیام میں وہاں مل گئے۔ وہ خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ گر قبول افتد کل آٹھ عدد ہیں جو رجسٹری پارسل پوسٹ روانہ کر رہا ہوں۔

مخلص

عبدالقادر عفی عنہ

(۲)

محترم جناب سید صاحب

سلام ممنون!

برادر محترم عبدالقادر موریشس والوں کے نام آپ کا نوازش نامہ مورخہ ۲۱۔اپریل موصول ہوا۔ شکریہ

راقم الحروف تاجر کتب ہے۔ اس لیے موصوف نے آپ کا خط مجھے ارسال فرمایا تاکہ میں آپ کو ڈراموں کے متعلق جو کچھ مجھے معلوم ہے تحریر کروں۔

آپ کو گجراتی ڈراموں اور اُردو ڈراموں کی فہرست چاہیئے۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ آپ جہانگیر بک ڈپو نولکھا بازار لاہور یا کس تاجر کتب کی فہرست جو ڈرامے طبع کرتے ہوں ملاحظ فرمائیں تو میرا خیال ہے کہ آپ کو ڈراموں کے متعلق زیادہ معلومات حاصل ہوں گی۔ اس لیے کہ جس قدر ڈرامے طبع ہوئے ہیں وہ سب لاہور کے تاجران کتب نے چھاپے ہیں۔

میں خود بھی آپ کے ارشاد کے مُطابق جلد ہی مقامی لائبریریوں میں گھوم کر ڈراموں کی فہرست ارسال کر دوں گا۔

اُردو زبان اور گجراتی حروف میں جتنے ڈرامے شائع ہوئے ہیں، ان میں سے بیشتر خدا کے فضل سے ہمارے طبع شدہ ہیں۔ تین اور ڈرامے آج ارسال کر رہا ہوں:

زہری سانپ، محبت کا پھول اور خدا دوست۔

ڈراموں کے متعلق اور کیا تفصیل آپ کو چاہیے، مجھے تحریر فرمائیں۔ میں اپنی امکانی کوشش سے آپ کو معلومات بہم پہنچاؤں گا۔

میں بھائی عبد القادر صاحب کا مشکور ہوں کہ اُنھوں نے ایک نامور ادیب اور ناشر سے میرا تعارف کرایا ہے جو یقیناً میری معلومات میں اضافے کا باعث ہوگا۔

آپ نے جن ڈراموں کے لیے لکھا ہے۔ میں ان کی بھی تلاش کر رہا ہوں، مگر ان کے دستیاب ہونے کی اُمید کم ہے۔

فقط

آپ کا مخلص

حسن الدین نظامی

اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے۔

اس سلسلے میں بھارت کے تاجران کتب کے علاوہ پاکستان کے مختلف شہروں کے تاجران کتب سے بھی رابطے کیے گئے۔ مذکورہ بالا ڈائری میں ایسے پچاس تاجران کتب کے پتے درج ہیں۔ ذاتی دوستوں سے مدد کے ضمن میں اس ڈائری میں ۷۔جنوری ۱۹۵۷ء کے خانے میں، احسن علی خاں، پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول کے پتے کے ساتھ لکھا ہے: "ملٹری محکمہ تعلیم کے جن صاحب کا پتہ الیاس مرزا صاحب نے مرشد آبادی ڈراما کے متعلق معلومات حاصل کرنے کو دیا تھا۔ ان کا سراغ لگانے کو میجر میاں نے یہ تجویز کیا ہے۔"

جون ۱۹۶۶ء میں جب میرا تقرر مجلس ترقی ادب میں بطور مدیر تالیفات ہوا تو اس وقت تاج صاحب کلاسیکی ڈراموں کی جمع آوری اور ترتیب و تدوین کی منصوبہ بندی کا کام زور و شور سے انجام دے رہے تھے۔ اس سلسلے میں مجھے بھی پرانی دکانوں کا سراغ لگانے اور کلاسیکی ڈرامے تلاش کرنے کا کام سونپا گیا۔ لوہاری اور شاہ عالمی دروازے کے

درمیان ورق کوہاں کے بازار میں جے ایس سنت سنگھ والوں کی پرانی دُکان پر میں اور تاج صاحب مل کر گئے تھے اور وہاں سے تیس چالیس پرانے چھپے ہوئے ڈرامے تلاش کئے تھے۔ منوں مٹی میں اٹے ہوئے فنگس اور پھپھوندی مارے ڈرامے تاج صاحب نے جس محبت اور لگن سے جمع کیے اس کا اندازہ کوئی قلمی مخطوطات کا شائق ہی لگا سکتا ہے۔

یہ داستان دراز ہو جائے گی اگر ڈراما خورشید کی تلاش اور بازیافت کی تفصیل بیان کی جائے۔ اس کا حصول تو رویت ہلال عید سے کم نہ تھا لیکن اس سے زیادہ مشکل اس کے متن کی صحت کا اطمینان تھا۔ جناب نائب حسین نقوی جو یہ ڈراما بمبئی کی کوچہ گردی کے بعد لائے تھے، اُنھوں نے تاج صاحب کو خورشید کی گجراتی رسم الخط میں اشاعت اور اُردو رسم الخط میں اس کی نقل حرفی دونوں مہیا کی تھیں تاج صاحب کو یہ شبہ ہو گیا۔ کہ شاید نقل حرفی قابل اطمینان نہیں۔ چنانچہ گجراتی رسم الخط کے ایک ماہر جناب اے۔ کے۔ فاروقی کو تلاش کیا گیا جو خود گجراتی تھے اور اُن دنوں بمبئے کلاتھ ہاؤس انارکلی لاہور میں مینجر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ میرے فرائض کار میں شامل تھا کہ ہر روز ان کے پاس جاؤں اور وہ اپنی سہولت کے مطابق جتنے صفحے ہر روز کر سکیں اصل اور نقل حرفی کا مقابلہ کر لے تصحیح کے بعد مجھے دے دیں۔ یہ سلسلہ مہینوں تک جاری رہا۔ تاج صاحب نے خورشید کے دیباچے میں میرا اور فاروقی کا بہت اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

سید امتیاز علی تاج کی ناگہانی وفات پر اُردو کلاسیکی ڈرامے کی چھ جلدیں شائع ہو چکی تھیں اور ساتویں جلد بندی کے مراحل میں تھی۔ اس کے علاوہ متعدد جلدوں کی وہ نہ صرف تدوین کر چکے تھے بلکہ اِن پر مفصل مقدمے اور دیباچے بھی تحریر فرما چکے تھے۔ چنانچہ ڈراموں کے جو متون تاج صاحب کی وفات کے بعد استاد گرامی پروفیسر سید وقار عظیم کے اہتمام یا بعض ان کے لکھے ہوئے مقدموں کے ساتھ شائع ہوئے ان کی فنی اور علمی تدوین تاج صاحب رُخصت ہونے سے پہلے مکمل کر چکے تھے۔

اسلوب تدوین

سید امتیاز علی تاج نے اپنے مرتبہ اردو کے کلاسیکی ڈراموں کی افتتاحی تقریب اپنی زندگی کے آخری دنوں میں منعقد کرنے کا پروگرام مرتب کیا تو مجھ سے اس تقریب میں اپنے اسلوب تدوین پر مقالہ پڑھنے فرمائش کی۔ افسوس کہ ان کی زندگی میں یہ فرمائش پوری نہ ہو سکی ان کی وفات کے بعد ۲۶۔ مئی ۱۹۷۰ء کو اس سلسلے میں منعقدہ تقریب میں جو معروضات میں نے پیش کیں گیں، حسب ذیل ہیں :

آج سے چار سال پہلے جب مجھے مجلس کی ملازمت ملی تو سید امتیاز علی تاج نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کے ذمے دو کام ہیں۔ ایک کلاسیکی کتابوں کی ترتیب و تدوین اور دوسرا میرے ساتھ ڈراموں کے کام میں معاونت، میں نے عرض کیا: سید صاحب میں نے ایم۔اے اردو کیا ہے اور اس کلاس میں اُردو کے کلاسیکی ڈراموں پر تنقید تو پڑھائی جاتی ہے، کلاسیکی ڈراموں کے متن نہیں پڑھائے جاتے۔ ایم۔اے اردو کے طالبعلم کو ڈرامے میں اندر سبھا کے بعد آغا حشر کے ڈراموں اور ان کے بعد انار کلی کا نام ازبر کرایا جاتا ہے۔ اس کے درمیان جو کچھ ہے، ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کی کتابوں میں ہے جن کی معلومات اس قدر اُلجھی ہوئی ہیں کہ کچھ پلے نہیں پڑتا۔ سید صاحب میری اس بات پر مسکرائے اور فرمایا " کوئی بات نہیں، میں آپ کو تمام ڈرامے سبقاً سبقاً پڑھا دوں گا۔ اچھا ہے اسی بہانے آپ کو ڈراما پڑھنے اور سمجھنے کی تربیت حاصل ہو جائے گی۔" میں نے اس عنایت کو بہت بڑی نعمت جانا اور ہر قسم کی خدمت کا سید صاحب کو یقین دلایا۔ اس کے بعد یہ معمول ہوا کہ سید صاحب ہر روز مجھے بلا کر اپنے پاس بٹھا لیتے۔ ڈرامے کی نقل اپنے سامنے رکھتے، اصل پڑھنے کے لیے مجھے ارشاد ہوتا وہ سنتے جاتے اور اپنے سامنے رکھی ہوئی نقل کو درست کرتے جاتے، تدوین کے اُصولوں کے تحت اس کی نوک پلک سنوارتے، اولی صُورت دیتے اور جگہ جگہ حواشی کے

نمبر دے کر مجھے املا کرواتے۔

سید صاحب نے ڈرامے کی تیس جلدوں کا جو منصوبہ تیار کیا تھا، اس میں سب سے پہلی جلد ان کے ڈرامے کی تاریخ پر لکھے ہوئے طویل مقدمے اور بمبئی کے پہلے اردو ڈرامے "خورشید" کے متن پر مشتمل تھی لیکن خورشید کا متن جسے سید صاحب ۱۹۵۷ء سے تلاش کر رہے تھے ہنوز دستیاب نہ ہوا تھا اور اس کے بارے میں بے شمار حضرات سے خط و کتابت جاری تھی لہٰذا مجبوراً دوسری جلد کے مصنف یعنی نسر وان جی مہر وان جی خان صاحب آرام کے ڈراموں کی ترتیب و تدوین جاری تھی۔ میں نے آرام کی پہلی جلد کے بجائے دوسری جلد کے ڈراموں کی تدوین میں شرکت کی۔ آرام کے ڈراموں میں گجراتی اور مرہٹی کے الفاظ اور محاورں کی کثرت ہے سید صاحب کو ہندی زبان تو خاصی حد تک آتی تھی لیکن گجراتی اور مرہٹی سے واقف نہ تھے۔ لہٰذا ان زبانوں کے الفاظ، محاورات اور عبارتوں کا نام اُنھوں نے گڑبڑ رکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ آرام کی تدوین کے سلسلے میں یہ مسئلہ بھی اہم تھا کہ آیا موجودہ قارئین کے لیے بمبئی کا محاورہ اور زبان قابل فہم بھی ہوں گے یا نہیں۔ دوسری بات جو ان ڈراموں کے سلسلے میں بلکہ مرتب ہونے والے تمام کلاسیکی ڈراموں کے ضمن میں اہم تھی وہ یہ کہ کلاسیکی ڈراموں کے متون خواہ وہ بمبئی کے چھپے ہوئے ہوں یا دہلی، لکھنؤ اور لاہور کے، مصنف کے لکھے ہوئے مسودے سے عموماً شائع نہیں ہوتے تھے۔ پھر انھیں ادبی فن پاروں کی حیثیت سے چھپنا بھی کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ وہ تو بس یوں تھا کہ ناشرین تماشائیوں کی دل چسپی کے لیے کسی ایکٹر سے سن کر ڈرامے کا مسودہ تیار کرتے تھے اور مصنف سے اجازت لے کر اسے تقریباً عین اسی طرح چھاپ دیتے تھے، جیسے آج کل بھی فلم بینوں کی تفریح کے لیے فلمی گانوں کے کتابچے شائع ہوتے ہیں۔ سیدؔ امتیاز علی تاج انہی ایڈیشنوں سے ڈرامے مرتب کر رہے تھے لیکن ان کے پیش نظر تفریح نہ تھی بلکہ ان کا نصب العین ان کلاسیکی ڈراموں کو صنف ادب کی گمشدہ کڑیاں سمجھ کر انھیں تاریخ ادب

میں شامل کرنا تھا۔

سید صاحب نے ترتیب و تدوین کے دوران کن کن اُصولوں کو سامنے رکھااور کن کن مشکلات پر قابو پایا، اس کا بیان ایک طویل گفتگو کا تقاضا کرتا ہے، جو اس مختصر تحریر میں ممکن نہیں۔ اس وقت میں صرف ان کیفیات اور تاثرات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کا ڈراموں کی تدوین کے دوران میں نے سید صاحب کی ذات میں مشاہدہ کیا۔

ڈراما تاج صاحب کی شخصیت کا جزو نہیں تقریباً کل تھا۔ وہ جب ڈراما پڑھتے یا اس پر گفتگو کرتے تو ان پر اس قدر خشوع و خضوع اور محویت کا عالم طاری ہوتا کہ جیسے وہ ڈرامے کی بجائے اپنی ذات پر غور و خوض کر رہے ہوں۔ آرام کی تدوین کے سلسلے میں اجنبی الفاظ کو سمجھنے اور حل کرنے میں جس قدر کاوش اور عرق ریزی سے سید صاحب نے کام لیا، وہ انہی کا حصہ تھا۔ غلط عبارتوں کی تصحیح قیاسی کا مرحلہ بھی معمولی نہ تھا۔ ہر گجراتی دان، زبان دان اور ہر ڈرامے کے جاننے والے سے اس قدر طالب علمانہ انداز سے پوچھنے کہ انکساری کا حق ادا ہو جاتا۔ جب تک کسی بات پر خود اچھی طرح اطمینان نہ کر لیتے، آگے نہیں پڑھتے تھے۔ فرض کیجیے کوئی بات کسی دوسرے کے ذہن میں واضح ہو گئی اور ابھی سید صاحب اس کے تمام پہلوؤں پر غور نہیں کر سکے تو بڑی خوش طبعی کے موڈ میں فرماتے: "پرنتو آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن یہ بات ابھی اپن کی گدی میں نہیں پڑی۔" پھر مختلف لغت دیکھے جاتے، اس کے بعد کسی قریبی ساتھی سے پوچھا جاتا، فرمایئے مولانا آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ اگر اطمینان نہ ہوتا تو ڈاکٹر سید عبد اللہ، پروفیسر سید وقار عظیم، سید عابد علی عابد، ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر محمد صادق، ڈاکٹر وحید قریشی غرضیکہ بے شمار حضرات سے مشورہ کیا جاتا۔ گجراتی اور مرہٹی زبانوں کے لیے سید صاحب کے مستقل مشیر جناب اے جی شیخ، سیکرٹری اورینٹ میچ کمپنی تھے لیکن انہی پر کیا موقوف تھا۔ آرام کے ڈراموں میں پارسیوں کے گانوں کے تراجم کے لیے مجھے کم از کم ایک درجن گجراتی دانوں کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا اور ہر شخص کے

پاس بھیجتے ہوئے سید صاحب فرماتے : نوشاہی صاحب میری طرف سے مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کرنا نہ بھولیے۔ سید صاحب کا کمال یہ تھا کہ اگر کسی سے ایک لفظ بھی دریافت کرتے تو اس کا شکریہ دیباچے ضرور ادا کرتے تھے۔

میں نے سید صاحب کی خدمت میں ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۰ء تک تقریباً چار سال ڈرامے کی تدوین کے سلسلے میں حاضری دی ہے۔ اس عرصے میں ان کی شخصیت کو بے حد قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ان کا غصہ بھی دیکھا۔ ان کی والہانہ محبت اور گرم جوشی بھی دیکھی مختلف مسائل پر ان سے دس دس گھنٹے کی گفتگو بھی ہوئی۔ لوگوں اور چیزوں کے بارے میں ان کے تعلق اور نفرت دونوں کا مشاہدہ بھی کیا، مجھے یقین ہے کہ ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا کوئی شخص بیک وقت احاطہ نہیں کر سکتا۔ سید صاحب کی شخصیت کھلی ہوئی کتاب تھی۔ وہ نہ خود نمائی اور جھوٹی وضعداری کے کپسول میں رہنا پسند کرتے تھے اور نہ ہی ایسے آدمیوں کو اچھا سمجھتے تھے جن کے پاس بیٹھ کر دوسرے آدمی کو اپنی شخصیت کم تر نظر آتی ہو۔ سید صاحب کی ذات میں ایک بات جو نمایاں نظر آتی تھی۔ وہ ان کا اپنے فن سے لگاؤ تھا۔ وہ ڈرامے کو اپنی روح سمجھتے تھے اور اگر میرے اس جملے کو غلط معنی نہ دیئے جائیں تو یوں کہوں گا کہ سید صاحب ڈرامے کی ترتیب و تدوین کا کام عبادت سمجھ کر کرتے تھے۔ اس قدر یکسوئی اس قدر انہماک کہ رشک آنے لگتا۔ قابل تصحیح مقامات پر رُکتے تو کئی کئی دن غور و خوض جاری رہتا۔ اکثر فرماتے "غلط کو درست کر دینا کوئی مشکل کام نہیں، مشکل کام غلط کو غلط رکھنا اور مصنف کا اصل روپ پیش کرنا ہے اور اس کام کے لیے علم و فضل کے علاوہ ذوق اور تربیت بھی درکار ہے۔" تصحیح قیاسی کے سلسلے میں سید صاحب اصل کے اس قدر قریب رہتے تھے کہ تصرف کا گمان تک نہیں ہوتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس روز خورشید کے ڈرامے کے ملنے کی خوش خبری پہنچی اور جس روز سید صاحب کو اس کے متن کی نقل ملی، سید صاحب کی خوشی کا

عالم دیکھنے کے لائق تھا۔ باربار کہتے تھے۔ "آج کا سورج پہلے کبھی طلوع نہیں ہوا۔"

آرام کے تمام ڈرامے سید صاحب نے مجھے سبقاً پڑھائے تھے۔ میری عادت تھی کہ میں جگہ جگہ رُکتا اور سید صاحب سے مختلف النوع سوال کرتا۔ بعض سوال خاصے بچگانہ بھی ہوتے لیکن سید صاحب جس شفقت اور محبت سے سمجھاتے، اس سے سید صاحب کے وہ الفاظ ہمیشہ یاد آجاتے کہ "کوئی بات نہیں میں آپ کو ڈرامے سبقاً پڑھا دوں گا۔ آرام کی دونوں جلدیں مکمل ہونے کے بعد سید صاحب کو مجھ پر اس قدر بھروسا ہوگیا تھا کہ ہر نئے ڈرامے کو شروع کرنے سے پہلے اسے مجھے پڑھنے کی ہدایت فرماتے تھے اور اس کے بارے میں میری رائے بھی طلب کرتے تھے۔

دیباچے اور تبصرے بھی بڑے مرحلے طے کرکے مکمل ہوتے۔ بعض اوقات ایک ایک دیباچہ پانچ پانچ مرتبہ لکھتے، پھر جاکر وہ آخری صورت اختیار کرتا۔ سید صاحب اپنے قلم سے لکھنے کے اس قدر عادی تھے کہ ان کا لکھا ہوا جتنی مرتبہ ٹائپ ہوتا، ہر مرتبہ پڑھتے ہوئے اس میں تبدیلیاں کرتے جاتے۔ لکھنے کا طریقہ عجیب وغریب تھا۔ موٹے نب والے قلم سے لکھتے۔ باریک باریک الفاظ جیسے موتی پروئے جارہے ہوں۔ الفاظ کی کفایت شعاری کے ساتھ ساتھ کاغذ کی بچت بھی مدِ نظر رہتی تھی۔ سطروں کے اندر سطریں لکھتے۔ جتنی جگہ میں دو سطریں لکھی جاتی ہیں۔ سید صاحب چار سطریں لکھتے حتیٰ کہ بعض اوقات اپنا لکھا ہوا بھی انہیں شیشے کی مدد سے پڑھنا پڑتا تھا۔ جس طرح دیباچہ یا تبصرہ کئی مرتبہ لکھا جاتا، اسی طرح پروف بھی کئی مرتبہ دیکھتے اور ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور کرتے۔ اُصول تدوین میں ان کا طریق کار عام محققین سے مختلف تھا۔ سید صاحب کے مرتبہ متون میں آپ کو کسی جگہ بھی اُصول تدوین جامد شکل میں نظر نہیں آئیں گے۔ سید صاحب فرماتے تھے: "تخلیقی انسان وہ ہے جو ہر آن اپنی ذات کا محاسبہ کرتا رہے۔" وہ ایک بزرگ کی زبان سے سنا ہوا یہ جملہ اکثر دہرایا کرتے تھے کہ "عقیدے کا کیا پوچھو ہو، وہ تو بدلتا رہوے ہے۔" اور کہتے تھے

انسان کو اپنے رویوں کی صحت کا وثوق کرتے رہنا چاہیے۔ اگر کوئی امر نظر ثانی کا محتاج ہو تو اس سلسلے میں عار محسوس نہیں کرنی چاہیے۔" چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ آرام، ظریف اور رونق تینوں مصنفوں کے ڈراموں کی تدوین میں طریق کار کا نمایاں فرق موجود ہے۔ ان کے بعد جب خورشید کو مرتب کرنے کی نوبت آئی تو ان تمام اُصولوں پر نظر ثانی کی گئی۔ خورشید کے متن کی تدوین محنت اور عرق ریزی کی انتہا ہے۔

سید صاحب ڈرامے مرتب کرتے وقت ان کی کیفیت سے بے حد لطف اندوز ہوتے تھے۔ میں نے بعض اوقات سید صاحب کو ٹھمریوں اور دادروں کے بول بڑے اچھے سروں میں گنگناتے ہوئے بھی سنا ہے۔ بعض اوقات میز پر انگلیوں سے ہلکی ہلکی گت بھی جاتے تھے اور اکیلے بیٹھے اس طرح گنگناتے تھے کہ ان پر وجد کی کیفیت طاری نظر آتی تھی۔ آرام کا ڈراما لعل و گوہر انھیں بے حد پسند تھا بالخصوص اس کی ٹھمریوں کے بول اور طرزیں سید صاحب کو بہت متاثر کرتی تھیں۔ جن طرزوں کو سید صاحب اکثر اکیلے بیٹھے گنگنایا کرتے تھے، یہ ہیں :

۱۔	میں تو نہ جاؤں موری میاّ	۲۔	موری اکھیاں پھر کن لاگیں
۳۔	آج گھن بوندن برسے رے	۴۔	چلتی پون میں سو گئی انگنا

تاج صاحب کے انداز تحریر اور اسلوب تدوین پر تفصیلی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مختصر ترین تحریر میں تمام مطالب کی گنجائش ممکن نہیں ہے۔

سید امتیاز علی تاج کی شاعری

سید امتیاز علی تاج صاحب اسلوب ڈرامہ نویس اور بلند پایہ نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوش طبع شاعر بھی تھے۔ یہاں ان کی شاعری کے چند نمونے یقیناً قارئین کے لیے دل چسپی کا باعث ہوں گے۔ ان کی غزل ماہنامہ مخزن کے نومبر و دسمبر ۱۹۲۱ء کے شمارے میں شائع ہوتی تھی جہاں ان کے نام کے ساتھ اس وقت کے مدیر مخزن ابو البیان بیدل شاجہان پوری نے "ادیب سحر نگار، مولانا سید امتیاز علی تاج ایڈیٹر کہکشاں" کے الفاظ لکھے تھے۔

تینوں نظمیں پہلی مرتبہ سید امتیاز علی تاج کے زیرِ ادارت چھپنے والے بچوں کے اخبار "پھول" میں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد تاج صاحب نے اُنھیں اپنی مرتبہ کتاب "پھول باغ" مطبوعہ ۱۹۳۶ء میں شامل کیا۔ غزل اور تینوں نظمیں صحیفہ تاج نمبر میں بھی جناب محمد حنیف شاہد کی مختصر یادداشت کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں۔

غزل

پھر لطف دیکھو عشق کے راز و نیاز کا
پردہ جو درمیاں سے اُٹھے احتراز کا

اک بار مجھ سے مل کے وہ سو بار پھر ملے
دھڑکا انھیں لگا تھا جو افشائے راز کا

تاریک سا نشہ مری آنکھوں میں چھا گیا
آیا خیال جب تری زلفِ دراز کا

افشائے راز دوست پہ کرکے ہوا یہ علم
وجہِ زبانِ عشق تھا اظہار راز کا

مضرابِ التفات نے چھیڑا جو سازِ عشق
نغمہ فلک رسا ہوا ہستی کے ساز کا

دنیا دکھائی دیتی تھی مخمور سی مجھے
وہ دیکھنا تری نگہِ نیم باز کا

عالم میں اک مجھی کو کیا زخمیِ نظر
قائل ہوں میں تری نگہِ امتیاز کا

کرسی اور فرش

کرسی اور فرش میں تھی چھیڑ بہت عرصے سے
آخر اک روز کہا فرش سے یہ کرسی نے

کچھ تری قدر نہیں اور تو ایسا ہے ذلیل
پاؤں کے نیچے بھی رکھنے کے نہیں قابل ہے

مجھ کو اول تو جگہ ملتی ہے تیرے سر پر
تجھ پہ سب لے کے چلے آتے ہیں اپنے جوتے

ہو اگر میز مرے پاس تو پھر کیا کہنا
کیسے اک دوسرے کے ساتھ ہیں ہم سج جاتے

مجھ پہ ہی بیٹھنا ان لوگوں کو آتا ہے پسند
ہیں نئی روشنی کے چاہنے والے جتنے

رکھے جاتے ہیں گدیلے مرے اوپر جس وقت
پھر چھپر کھٹ بھی نہیں میرے مقابل آتے

بیٹھنے والوں کو دیتی ہوں میں آرام ایسا
مجھ سے اُٹھنے کا نہیں نام ذرا وہ لیتے

تو مقابل میں مرے آئے گا کیا او احمق!
اچھے اچھے بھی نہیں میرے تو آگے آتے

سن کے یہ بات میاں فرش نے کرسی سے کہا
اے بوا کرسی جو تو کہتی ہے، بالکل سچ ہے
پوچھ، دنیا میں اگر ہو ہی گئی کچھ تیری
اس پہ مغرور ہو، لازم نہیں ہرگز یہ تجھے
پوچھ تیری ہے زیادہ تو نہیں میری بھی کم
پھر تُو اس بات میں کچھ بڑھ کے نہیں ہے مجھ سے
گرچہ مغرب میں ترے پوچھنے والے ہیں بہت
چاہنے والے ہیں مشرق میں بہت سے اپنے
ہند بھر میں نہیں کوئی بھی گھر ایسا اے بی
جس کے مالک نہ مری قدر ہوں کرنے والے
اور اگر بجتی ہے تم میز کی ہمراہی میں
ہوتی ہے میری سجاوٹ بھی مرے تکیے سے
چاندنی اُجلی ہو اور اس پہ رکھا ہو تکیہ
چاہتا ہے یہی انساں کہ وہاں جا بیٹھے
تم کو آرام اگر ہ تو فقط میرے طفیل
تم تو قایم ہو مری رحم دلی کے صدقے
تم کھڑی رہتی ہو ہروقت، مگر دیکھو ہم
ہیں امیروں کی طرح چین سے لیٹے رہتے
اور خوبی ہے یہ مجھ میں کہ تمھاری مانند
کچھ بہت مجھ پہ ٹکے خرچ نہیں ہیں آتے
اے بوا!! ہو جو ذرا بَیت تمھاری ڈھیلی
خرچ ہوتے ہیں بنانے میں بہت سے ٹکےؔ

ٹوٹتی ہے جو کوئی چول وغیرہ تیری
پھر کسی کام بھی آتی نہیں، تو ردی ہے

رنگ تیرا جو اتر جائے کسی باعث سے
سخت بدبو کے ہیں روغن ترے تن پر لگتے

برخلاف اس کے اگر ہوتے ہیں ہم کچھ میلے
دھل کے آتے ہیں تو ہو جاتے ہیں اُجلے چٹے

تیری مانند نہیں خرچ زیادہ میرا
دھوبی دھلوائی کے لیتا ہے بہت کم پیسے

میں امیروں کو غریبوں کو ہر اک کو ہوں پسند
تاج تھے جن کے سروں پر وہ مجھے چاہتے تھے

کرسی شرمندہ ہوئی فرش کی باتیں سن کر
یاد رکھو کہ بڑے بول کا سر نیچا ہے

وطن کی یاد پنجرے کی قید میں

یاد گلشن کی مجھے کرتی ہے کتنا بے قرار
واں گزارا کرتے تھے ہم بھی کبھی اپنی بہار
باغ کے پودوں پہ تھا اپنا ہمایا گھونسلا
دوست اپنا آسماں تھا ان دنوں کتنا ہما
حوض کے پرلی طرف کونے میں تھا جو اک گلاب
چاندنی پھیلاتا جس پہ رات کو تھا ماہتاب
اک گلابی پھول بھی ہر روز تھا جس پر کھلا
جس پہ تھیں ہر صبح کرنیں دھوپ کی پڑتی سدا
تھا اسی بوٹے کی شاخوں پر ہمارا آشیاں
چین سے رہتا تھا میں، غل کا نہ تھا نام و نشاں
کیا مجال اس جا کوئی چڑیا بھی کچھ غل کر سکے
پھول اس پودے کے دشمن سے چھپاتے تھے مجھے
دور ہیں آہ اس وطن سے اب ہیں ہم قیدی نے
وہ بہاریں صبح کی اور آہ وہ دن کیا ہوئے؟

اب ترستے ہیں، نظر آتا نہیں اپنا کوئی
سوکھ کر کانٹا ہوئے اپنا نہیں آتا کوئی

رحم کر ظالم کہ میں پنجرے میں ہوں گھبرا گیا
دل وطن کی یاد میں ہائے تڑپتا ہے مرا

کھول دے پنجرے کے پٹ میں سخت اب بے چین ہوں
چھوڑ دے مجھ کو کہ میں جا کر وطن کو دیکھ لوں

الوداع

غم و اندوہ کی آمد ہے خوشی کی تردید
نالہ یاس ہے آوازِ شکست اُمید
ہے پیامِ شبِ دیجور وداعِ خورشید
رُخصتِ دوست کا انجام ہے کیا حسرت دید
مہرباں کوئی بچھڑ کر جو کہیں جاتا ہے
بہرِ غم خواری دل ہجر کا غم آتا ہے

پیشوائی کے لیے ہجر کی آتے ہیں بہم
آہ سوزاں، دلِ غم دیدہ و چشم پُرنم
کلفتِ دردِ جدائی ہے بری شے ہمدم
سارے جذبات پہ حاوی ہے یہ فرقت کا الم
دوست سے دوست جو دُنیا میں جدا ہوتا ہے
عالم شوق میں اک حشر بپا ہوتا ہے

آج کالج سے جدا ہوتے ہیں اسٹیفن سن
جن کے انوار سے تھی اپنی شبستاں روشن
بلبل باغ ادب، حسن رخِ شاہدِ فن
جرعہ نوشِ مئے شیراز، قدح خوار سخن

ہیں یہی ظلِ کرم سایہ رحمت ہم کو
ان کی بخشش سے ملی علم سی نعمت ہم کو

آپ کے حسنِ بیاں کی نہیں ممکن ہے مثال
خلق و شفقت میں نظیر آپ کا ملنا ہے محال
اور کیا آپ کی تعریف کروں میں فی الحال
نہیں محتاج بیاں آپ کا علم اور کمال

جتنے احباب ہیں، عاشق ہیں، تمنائی ہیں
جتنے شاگرد ہیں سب آپ کے شیدائی ہیں

طلبا کو بھی دلی دوست سمجھتے تھے جناب
ایسے استاد مکرم ہیں جہاں میں نایاب
سب کے دل آپ کے جانے سے ہوئے ہیں بیتاب
سارے شاگرد ہیں مغموم تو مضطر احباب

چین لینے نہیں دیتا غم فرقت ہم کو
یاد آئے گی بہت آپ کی شفقت ہم کو

گر محبت میں کشش ہے تو یہ ہے ہم کو یقین
آپ کو پھر یہ کشش کھینچ کے لائے گی یہیں
چھوڑتی ہے دلِ احباب کو یہ چیز کہیں
پاس بھی آہی پہنچتا ہے جو ہو دل کے قریں

آپ پھر آئیں گے پھر دورِ مسرت ہو گا
دور پھر دل سے ہمارے غمِ فرقت ہو گا

التجا تاج کی ہے تجھ سے یہی میرے خدا
ہم سے ہو کر یہ جدا دل سے نہ ہو جائے جدا
ہر جگہ اس پہ رہے سایہ فگن فضل ترا
یاد کالج کی رہے اس کے تصور میں سدا

دل سے اک دم بھی نہ ہو دور خیالِ کالج
گھر پہ جا کر بھی رہے فکرِ کمالِ کالج

اے خدا دہر میں یہ ارض و سما ہیں جب تک
زینت روے جہاں صبح و مسا ہیں جب تک
پھول گلزار میں ممنونِ صبا ہیں جب تک
طائرانِ چمنی نغمہ سرا ہیں جب تک

یہ مکرم بھی سدا خرم و دل شاد رہے
صد و سی سال سلامت مرا استاد رہے

تصانیف تاج

انار کلی	مطبوعہ دار الاشاعت پنجاب لاہور
قرطبہ کا قاضی	"
لیلیٰ یا محاصرہ غرناطہ	"
آر۔یو۔آر (راسمز یونیورسل روباٹ)	مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور
ہیبت ناک افسانے	مطبوعہ دار لاشاعت پنجاب لاہور
بھارت سپوت	"
پردہ (قرآن کی روشنی میں)	"
شاہکار تصاویر	"
مجلس ترقی ادب	مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور
تعارف و خدمات	"
ننھی کتاب	دار لاشاعت پنجاب لاہور
منی کتاب	"
پیاری کتاب	"
دلاری کتاب	"
بچوں کی بہادری	دار لاشاعت پنجاب لاہور
ہماری کتاب	"
ابو الحسن	"
جادو کے برج	"

جھوٹ موٹ کا بھوت	دار الاشاعت پنجاب لاہور
کپو اور مانو	"
چڑیاخانہ حصہ اول	"
چڑیاخانہ حصہ دوم	"
پھول باغ ۔ حصہ اول	"
پھول باغ ۔ حصہ دوم	"
گدگدی ۔ حصہ اول	"
گدگدی ۔ حصہ دوم	"
پرستان ۔ حصہ اول	"
پرستان ۔ حصہ دوم	"
ٹھگوں کی کہانیاں	"
بھوتوں کی کہانیاں	"
سراغ رسانی کی کہانیاں	"
شہزادوں کی کہانیاں	"
گڑیوں کی کہانیاں	"
پھولوں کی کلیاں ۔ حصہ اول	"
پھولوں کی کلیاں ۔ حصہ دوم	مطبوعہ دارالاشاعت پنجاب لاہور
آج کل کی کہانیاں	"
ڈاکوؤں کی کہانیاں	"
شہزادیوں کی کہانیاں	"
بہادر کی کہانیاں	"
ہنس کی کہانیاں	"

چوروں کی کہانیاں	مطبوعہ دارالاشاعت پنجاب لاہور
ناگوں کی کہانیاں	"
جادو کی کہانیاں	"
عقلمندی کی کہانیاں	"
پریوں کی کہانیاں	"
سانپوں کی کہانیاں	"
نجومیوں کی کہانیاں	"
بونوں کی کہانیاں	"
خزانوں کی کہانیاں	"
جنوں کی کہانیاں	"
اسکول کی کہانیاں	"
کنجوسی کی کہانیاں	"
شاہوں کی کہانیاں	"
انصاف کی کہانیاں	"
بیربل کی کہانیاں	"
بچپن کی کہانیاں	"
انتقام کی کہانیاں	"
وزیروں کی کہانیاں	"
جان جوکھوں کی کہانیاں	"
بہنوں کی کہانیاں	"
لکڑہاروں کی کہانیاں	"
خانہ بدوشوں کی کہانیاں	"

طلسمات کی کہانیاں	مطبوعہ دار الاشاعت پنجاب لاہور
درویشوں کی کہانیاں	"
حاتم طائی کی کہانیاں	"
ملادو پیازہ کی کہانیاں	"
کسانوں کی کہانیاں	"
پیغمبروں کی کہانیاں	"
سمندری کی شہزادی	"
موت کا راگ	"
کمک اردو حصہ اول	"
کمک اردو حصہ دوم	"
کمک اردو حصہ سوم	"
خورشید (بمبئی کا ابتدائی ڈراما) جلد اول	مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور
آرام کے ڈرامے حصہ اول (جلد دوم)	"
آرام کے ڈرامے حصہ دوم (جلد سوم)	"
ظریف کے ڈرامے (جلد چہارم)	"
رونق کے ڈرامے حصہ اول (جلد پنجم)	"
رونق کے ڈرامے حصہ دوم (جلد ششم)	"

مقالاتِ تاج مطبوعہ تہذیب نسواں

مولوی سید ممتاز علی صاحب کی صحت	۲۶ جنوری ۱۹۳۵ء
	۲۳ فروری ۱۹۳۵ء
ابا جان	۲۹ جون ۱۹۳۵ء
تہذیب نسواں	۲۹ جون ۱۹۳۵ء
حیات ممتاز	۲۹ جون ۱۹۳۵ء
معذرت	۶ جولائی ۱۹۳۵ء
تہذیبی انجمنیں	۱۳ جولائی ۱۹۳۵ء
ایصال ثواب	۱۳ جولائی ۱۹۳۵ء
(یادگار ممتاز) اس پر میرے خیالات	۲۰ جولائی ۱۹۳۵ء
(قیام یادگار کی بہترین تجویز) اس پر ہمارے خیالات	۲۷ جولائی ۱۹۳۵ء
(ہماری لڑکیوں کی گمراہی) اس پر ہمارے خیالات	۲۷ جولائی ۱۹۳۵ء
ایصال ثواب	۳ اگست ۱۹۳۵ء
تہذیبی انجمنیں (اس پر ہمارے خیالات)	۳ اگست ۱۹۳۵ء
چار ضروری کام	۱۷ اگست ۱۹۳۵ء
ہم خود	۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء
مسلم انٹر کالج علی گڑھ	۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء
مسلم گرلز کالج علی گڑھ	۱۲ اکتوبر ۱۹۳۵ء
تہذیب ۱۹۳۶ء میں	۲ جنوری ۱۹۳۷ء

مضامین کا شمار	۲ جنوری ۱۹۳۷ء
تہذیبی انعامات	۲ جنوری ۱۹۳۷ء
عیادت	۲ جنوری ۱۹۳۷ء
جدید مطبوعات	۲ جنوری ۱۹۳۷ء
ہر مرد کا دکھ	۹ جنوری ۱۹۳۷ء
بیگم سجاد حسین مرحومہ	۹ جنوری ۱۹۳۷ء
ہماری اپاہج بیٹیاں	۱۶ جنوری ۱۹۳۷ء
ایک دوست کے ماما	۲۳ جنوری ۱۹۳۷ء
خود اعتمادی	۳۰ جنوری ۱۹۳۷ء
شہریار دکن کی سلور جوبلی	۶ فروری ۱۹۳۷ء
اخلاق پہننا	۱۳ فروری ۱۹۳۷ء
بیگم شاہ نواز کی کامیابی	۲۷ فروری ۱۹۳۷ء
بیگم رشیدہ لطیف کی کامیابی	۲۷ فروری ۱۹۳۷ء
حریت نسواں کے متعلق	۱۷ اپریل ۱۹۳۷ء
آنریبل میاں عبدالحی وزیر تعلیم	یکم مئی ۱۹۳۷ء
سالگرہ تہذیب	۳ جولائی ۱۹۳۷ء
بیگم اعزاز رسول	۷ اگست ۱۹۳۷ء
آہ سر راس مسعود	۷ اگست ۱۹۳۷ء
اسلامی تمدن	۲۸ اگست ۱۹۳۷ء
(بزرگان دین سے عقیدت) اس پر ہمارے خیالات	۹ اکتوبر ۱۹۳۷ء
حجاب کا ایک مختصر افسانہ	۶ نومبر ۱۹۳۷ء
سل اور دق کا انسداد	۲۵ دسمبر ۱۹۳۷ء

سال نو	یکم جنوری ۱۹۳۸ء
تہذیب ۱۹۳۷ء میں	یکم جنوری ۱۹۳۸ء
مضامین کا شمارہ	یکم جنوری ۱۹۳۸ء
تہذیبی انعامات	یکم جنوری ۱۹۳۸ء
عزیزہ سلطانہ سلمہا	یکم جنوری ۱۹۳۸ء
آہ میر افضل علی	یکم جنوری ۱۹۳۸ء
بیگم شاہد حسین	۸ جنوری ۱۹۳۸ء
ہوائی صلح سے سبق	۱۵ جنوری ۱۹۳۸ء
مسجد شہید گنج	۱۲ فروری ۱۹۳۸ء
آہ علامہ اقبال	۳۰ اپریل ۱۹۳۸ء
جواں مرگ مشتاق حسن	۲۶ جولائی ۱۹۳۸ء
میاں شاہ نواز مرحوم	۲۰ اگست ۱۹۳۸ء
بوڑھا فلسفی (ڈراما)	۷ جنوری ۱۹۳۹ء
بھائی اشتیاق کو صدمہ	۱۸ فروری ۱۹۳۹ء
آہ مولانا خلیل الرحمٰن	۲۵ فروری ۱۹۳۹ء
خلع بل اور مسلم صبیح	۸ اپریل ۱۹۳۹ء
تہذیب نسواں ۱۹۳۸ء میں	۷ جولائی ۱۹۳۹ء
تہذیبی انعامات	۷ جولائی ۱۹۳۹ء
ایک خط اور اس کا جواب	۲۷ جنوری ۱۹۴۰ء
آہ نواب احمد یار خاں	۱۰ اگست ۱۹۴۰ء
بیگم سردار عبدالصمد کا انتقال	۱۰ اگست ۱۹۴۰ء
حضرت سالک کو صدمہ	۳۰ اگست ۱۹۴۰ء

تہذیب نسواں کے حجم میں کمی	۲۴ مئی ۱۹۴۱ء
شیخ محمد اکرام مرحوم	۱۴ جون ۱۹۴۱ء
مستقبل کا ایک نظارہ	۵ جولائی ۱۹۴۱ء
چوالیسویں سالگرہ	۴ جولائی ۱۹۴۲ء
ملازموں کے سرٹیفکیٹ	۲۹ اگست ۱۹۴۲ء
منشی دیانرائن نگم آنجہانی	۲۸ نومبر ۱۹۴۲ء
بھائی یعقوب مرحوم	۲۸ نومبر ۱۹۴۲ء
لیڈی سر فضل حسین مرحوم	۲۸ نومبر ۱۹۴۲ء
عرشی صاحب مرحوم	۲۵ دسمبر ۱۹۴۲ء

چند اہم مقالات تاج

اردو ڈرامے کی مفاہمتیں	کارروان لاہور ۱۹۳۴ء
اردو میں ڈراما نگاری	ماہ نو کراچی جون، ۱۹۵۲ء
تھئیٹر کی ضرورت	ادب لطیف، ڈراما نمبر ۱۹۵۲ء
اقتباس	کارروان لاہور، ۱۹۳۲ء
اسٹیج کا ڈراما	تعلیم لاہور، جولائی ۱۹۵۴ء

سانحہ وفات

سید امتیاز علی تاج کو ۱۸ اور ۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء کی درمیانی شب دو نامعلوم نقاب پوش حملہ آوروں نے چاقوؤں کے پے در پے وار کر کے زخمی کر دیا اور آپ ۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ۱۸ اپریل کو ساڑھے گیارہ بجے میں تاج صاحب کے پاس بیٹھا تھا اور ہم مل کر کلاسیکی ڈراموں کے متون پر ہی کام کر رہے تھے کہ تاج صاحب نے اپنے مخصوص الفاظ میں کہا: "مولانا! آپن کو اجازت دیجیے۔ ایک ضروری میٹنگ میں جانا ہے۔ انشاء اللہ پیر کو بشرط زندگی ملاقات ہو گی۔" ۱۸ اپریل کو ہفتہ اور ۱۹ اپریل کو اتوار کا دن تھا۔ میں ۱۹ اپریل کو چھٹی کے دن علی الصبح کوئی اخبار دیکھے بغیر کسی گھریلو کام کے سلسلے میں اپنے آبائی قصبے شرق پور چلا گیا۔ وہاں بھی کوئی اخبار میسر نہیں تھا۔ شام چار بجے جب میں گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ تاج صاحب شدید زخمی حالت میں میو ہسپتال میں ہیں اور آپ کو بار بار یاد کر رہے ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا کہ دفتر کے آدمی تین چار مرتبہ گھر آ چکے ہیں۔ میرے ہوش اور حواس گم تھے۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس محبوب دل نواز کو کوئی سفاک زخمی بھی کر سکتا ہے۔ بھاگم بھاگ میو ہسپتال پہنچا۔ دھنی رام روڈ کی طرف سے ہسپتال کا جو دروازہ کھلتا ہے اس سے داخل ہوا تو سامنے گورنمنٹ لاہور کے صدر شعبہ فلسفہ پروفیسر محمد سعید شیخ نظر آئے، وہ مجھے دیکھ کر تیزی سے میری طرف لپکے اور مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر سسکیاں بھرتے ہوئے کہا: تاج صاحب چلے گئے۔ وہ صبح سے آپ کو بہت یاد کر رہے تھے۔ آپ کو نہ دیکھ سکے۔ یہ کہتے ہوئے اُنھوں نے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے ایک ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر کہا: یہ گوہر نوشاہی

ہیں جن کا ذکر تاج صاحب اور بیگم صاحبہ کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے ایک کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا اس پر دستخط کر دیں اور تاج صاحب کی لاش گھر لے جائیں۔ بیگم صاحب نے کہا تھا نعیم طاہر یا گوہر نوشاہی میں سے کوئی بھی آجائے تو اس سے دستخط لے لینا۔

میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور دستخط کرنے کی جرآت نہیں ہو رہی تھی کہ اتنے میں میں نعیم طاہر صاحب کو کار سے اُترتے دیکھا وہ بھی غالبًا لاہور سے باہر تھے اور حادثہ جانکاہ کی خبر پا کر اسی وقت پہنچے تھے۔ میں نے روتے ہوئے ان سے کہا کہ آپ دستخط کریں۔ چنانچہ نعیم طاہر صاحب نے دستخط کیے، خون آلود چادر میں لپٹے ہوئے تاج صاحب کو ایمبولیس میں رکھا گیا۔ دو تین آدمی جن میں میں بھی تھا ایمبولیس میں بیٹھے اور ہم اُنھیں ایبٹ روڈ پر اُن کے گھر لے آئے۔ وہاں لوگوں کا ایک اژدحام تھا۔ رات ہی کو غسل دیا گیا۔ لاہور میں اپریل، کا مہینہ گرم ہو جاتا ہے لہذا میت کو رات بھر رکھنے کے لیے چارپائی کے نیچے برف کے بلاک رکھے گئے۔

۱۹۔ اپریل ۱۹۷۰ء کی صبح کو جنازہ اُٹھا۔ مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے گلاب کے پھولوں کی چادر بنوائی گئی جو مجلس کی ہیئت منتظمہ کے صدر نشین جناب جسٹس ایس۔ اے رحمن اور میں نے ایک ایک طرف سے کھول کر تاج صاحب کے جسد خاکی پر ڈالی۔ جن لوگوں نے آخری دیدار کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ تاج صاحب اس قدر پر سکون نیند سوئے ہوئے تھے کہ ان کے مرنے کا کسی کو یقین نہیں ہوتا تھا۔

کل من علیہا فان والذکر اسم ربک ذوالجلال والاکرام ہ

باقی تفصیلات تاج صاحب کی وفات پر شائع ہونے والے سہ ماہی صحیفہ اور ماہنامہ کتاب لاہور کے خصوصی شماروں میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

سید امتیاز علی تاج کے سانحہ ارتحال کو یاد کرتے ہوئے مرحومہ بیگم حجاب امتیاز علی تاج نے اپنے جو تاثرات بیان کیے وہ ماہنامہ کتاب" کے تاج نمبر میں محفوظ ہیں۔ ان

کی ایک جھلک پیش خدمت ہے:

"فاصلے۔۔۔اجنبیت۔۔۔منزلیں۔۔۔اپنائیت۔۔۔روٹھنا، منانا۔۔۔

آپ نہیں جانتے۔۔۔

کوئی بھی نہیں جانتا۔۔۔

اور جو جانتے تھے ان میں ایک لحد کی گود میں سو رہا ہے اور دوسرا زخمی حالت میں بستر پر پڑا ہے۔ اجنبیت کے فاصلے کٹ جاتے ہیں۔ روٹھنے والے من جاتے ہیں۔ اپنائیت کی منزلیں آجاتی ہیں۔ عمر کا قافلہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ رفاقت کا بدھن خوب صورت اور مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔۔۔ اور پھر ایک رات آتی ہے۔۔۔ ایک رات ۔۔۔یہ ایک رات دنیا بدل کر رکھ دیتی ہے۔ اب کوئی کیسے روٹھے، کیسے منائے۔۔۔ قاتل کا ہاتھ رات کی تاریکی میں پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں خنجر ہے جو تمام فانی رشتوں کو قتل کر دیتا ہے۔ ایک جو جاننے والا تھا وہ خون میں لت پت ہو کر ڈھیر ہو جاتا ہے اور دوسرا جاننے والا زخمی ہو کر سالوں کی چپ کا قفل توڑ دیتا ہے۔۔۔

انارکلی کا خالق دنیا سے اُٹھ گیا۔

مگر حجاب کا امتیاز اس کی یادوں میں زندہ ہے، کبھی نہیں مرے گا۔۔۔ اور وہ بستر پر لیٹی، اپنی کم گوئی کی عادت اور روایت کو ترک کر کے بولتی چلی جا رہی تھی۔۔۔ یادیں جو مرے ہوئے آدمی کو بھی مرنے نہیں دیتی!!

"آپ جانتے ہیں کہ ایتاز سید تھے۔"

مگر آپ نہیں جانتے کہ وہ شہید ہیں اور پیاسے بھی تھے۔

دیکھئے۔ یہ مت لکھئے گا کہ ان کا قتل کیا گیا، امتیاز شہید ہیں وہ قتل نہیں ہوئے۔ امتیاز سید تھے۔ شہید ہیں اور پیاسے بھی تھے۔

آپریشن کے بعد انھوں نے پانی مانگا تھا۔ وہ دُنیا سے پیاسے اُٹھے۔ شہدائے کربلا کی رسم پوری کی۔

"یاسمین مجھے کہتی ہیں۔ ممی سب کو تو تفصیلات کا علم ہے پھر آپ کیوں بار بار بتاتی ہیں۔ یاسمین نہیں جانتی کہ تفصیلات کے حُسن کو تو میں ہی بیان کر سکتی ہوں۔ جی ہاں ان DETAILS کی خوب صورتی کو کچھ میں ہی بیان کر سکتی ہوں۔ اب میں باتیں کرتے ہوئے تھکان محسوس نہیں کرتی۔ تھکتی ہی نہیں ہوں۔ صبح سات بجے شروع ہوتی ہوں تو رات تک بولتی رہتی ہوں۔ سب حیران ہیں۔۔۔ مگر اسے کیا کہئے کہ جزئیات کا حُسن بار بار دہرانے سے ہی نکھرتا ہے اور جزئیات کی خوب صورتی میں ہی بیان کر سکتی ہوں۔۔۔"

"وہ رات بہت حسین تھی۔ بہت خوب صورت۔ ہوا چل رہی تھی۔۔۔ آسمان پر بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ ان بادلوں میں کتنا حُسن ہوتا ہے مجھے تو اُن سے عشق ہے، مگر بہت سارے بادل جمع ہو جائیں تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔۔۔ اور پھر بادل جمع ہو گئے تھے بہت سارے بادل۔۔۔ کالے دھبے۔۔۔ پھر بھی وہ رات بہت حسین تھی۔ میں امتیاز کی آواز سن کر اُٹھی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "یہ کیا کر رہے ہو۔" اور ایک نقاب پوش ان پر وار کر رہا تھا۔ امتیاز نے اسے میرے سامنے گرا دیا۔ میں نے ان سے پوچھا "تمہیں کیا چاہیئے۔۔۔ چابیاں۔۔۔ مگر وہ خاموش رہے۔ دونوں نقاب پوشوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی۔ ایک نقاب پوش نے امتیاز کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور ہاتھ گھما کر پشت پر وار کیا۔ مین نے اسے روکا تو اس نے مجھ پر وار کر دیا۔ دل کے قریب۔۔۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں۔ میں خوش قسمت ہوں۔ اگر وار تھوڑا سا اور اُوپر ہو جاتا تو دل پر گھاؤ لگتا۔" میں زخمی ہو گئی۔ میں شور مچا رہی تھی۔۔۔ امتیاز ہوش میں تھے۔ بڑی جان تھی ان میں۔۔۔ نقاب پوش بھاگ گئے۔ امتیاز سیڑھیاں اُتر کر نیچے آئے۔ نعیم کو فون کیا۔ میں نے پولیس کو اطلاع دی۔ خون بہہ رہا تھا مگر امتیاز خون سے نہ گھبرائے۔ وہ سید تھے اور سید خون سے کبھی نہیں گھبراتے۔۔۔"

منظومِ خراجِ عقیدت

کلب علی خان خائق

قطعہ تاریخ

رحلت سید امتیاز علی تاج صاحب مرحوم

تاج بزم ادب کی زینت تھے
بردبار اور تھے شگفتہ مزاج
کر دیا ان کو ہائے ہائے شہید
محفل علم وفن ہے سونی آج
سال رحلت ہے از سر نوحہ
باغ فردوس ہو نصیب تاج

۱۹۲۰ء - ۱۹۷۰ء

مظہر محمود شیرانی

قطعہ تاریخ

رحلتِ تاج پر بصد اندوہ
ہاتفِ غیب کی زباں بولی
کہ "ہوئے آج زندۂ جاوید
115
شاہ تمثیل امتیاز علی
۱۸۵۵+۱۱۵=۱۹۷۰ء

(۲)

شاہِ فن ، خالقِ انارکلی
چوں رواں شد بسوئے عالم پاک
مظہر دل گرفتہ گفت کہ "اف
آدمیت را تاج برد بخاک"
۱۸۸۹+۸۱=۱۹۷۰ء

عظیم قریشی

سید امتیاز علی تاج

اس نے سوچا
غمِ زیست اب تک مکمل نہیں
کربِ انسان کا میں ہی مداوا کروں
خود تماشا بنا
غم کا نقشا بنا
مرگِ تنہا بنا
وہ عرشِ جناں کی سحر بن گیا
ثبات واثر، اک قمر بن گیا
اس نے سوچا
غمِ زیست اب تک مکمل نہیں
کربِ انسان کا میں ہی مداوا کروں

المیہ ٔ تاج

اُدھوری تھی تشکیلِ غم تاج تیری
سرِ عرش
لوحِ ابد پر
تری موت نے
اُس میں اب
نقش آخر بھرا
زخم پھر ہنس پڑا
تو نے پائی بقا

سید امتیاز علی تاج

دوسروں کی نظر میں

انار کلی کے بارے میں چند آراء

☆ انار کلی کی زبان میں روانی اور انداز بیان میں دلفریبی ہے۔

(علامہ اقبال)

☆ انار کلی کی اشاعت ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔

(مرزا محمد سعید دہلوی)

☆ انار کلی اردو ڈرامہ کی تاریخ میں ہمیشہ یادر ہے گا۔

(احمد شاہ بخاری پطرس)

☆ انار کلی اسٹیج اور مطالعہ، ہر دو اعتبار سے کامیاب ہے۔اس کی اشاعت سے اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہوا ہے۔

(پروفیسر محمد دین تاثیر)

☆ ایک کتاب جس سے آنکھوں میں نور اور دل میں ہمدردی عشق مجبور پیدا ہوتی ہے

(سید سجاد حیدر یلدرم)

☆ مجھے جتنی کشش انار کلی میں ہوئی وہ کسی ڈرامے میں نہیں

(منشی پریم چند)

☆ یہ تصنیف ڈراما کی تاریخ میں نہ صرف اہم یادگار کے طور پر زندہ رہے گی۔ بلکہ ڈرامہ مانویسوں کے لئے مشعل راہ کا بھی کام دیگی۔

(ابو الاثر حفیظ جالندھری)

☆ دربارِ اکبری کی مرحوم شوکت اور انار کلی کی زندہ رگو رداستانِ محبت کو تاج کی انار کلی نے دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔

(حکیم احمد شجاع)

☆ انار کلی مشرق کی پُر اسرار اور پر شکوہ زندگی کے عاشقانہ پہلو کی ایک داستان جمیل ہے۔ جسے تاج کے اندازِ بیان نے غیر فانی بنادیا ہے۔

(مجید ملک)

☆ یہ ان کتابوں میں سے ہے اور ایسی کتابیں شاد و نادر ہی ہیں جنھیں دیکھ کر، پڑھ کر اور اپنے پاس رکھ کر ہمیشہ دل خوش ہوتا ہے اور ان کو ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔

(عنایت اللہ خاں ۔ عثمانیہ یونیورسٹی)

شوکت تھانوی :

"امتیاز صاحب ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں۔ بڑی میٹھی زبان ہے اور بڑا دلآویز اندازِ گفتگو ہر چند کہ خالص تجارتی آدمی ہیں مگر صورت سے بالکل ساہو کار نظر نہیں آتے اور نہ ایک خرانٹ قسم کے سرمایہ دار۔ بلکہ تجارت بھی تاجر بن کر نہیں ادیب بن کر کرتے ہیں البتہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ خوش قسمت ادیبوں میں سے ہیں جو ادب کی گود میں پل کر ادبی نقادوں میں پروان چڑھے۔

جیلانی کامران :

انار کلی" اُردو ڈرامے کی تاریخ میں ایک نہایت اہم کتاب ہے۔ اس کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس پر رائے رکھنے والے لوگوں کی تعداد کسی طرح کم نہیں ہے اور اس ڈرامے کے تذکرے کے بغیر اُردو ڈراما (جو اُردو ادب میں در آمد کی ہوئی صنف کی حیثیت رکھتا ہے) کی کہانی ان کہی رہتی ہے۔ مختلف لوگوں کی انار کلی کے بارے میں مختلف رائیں ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ انار

کلی (ڈراما) غالباً اس لیے مشہور ہوا ہے کہ اس نام کے ساتھ پچھلے ڈیڑھ سو برس سے لاہور کا ایک بارونق علاقہ منسوب ہوا ہے۔ انار کلی ڈراما، انار کلی بازار اور انار کلی کا مقبرہ، انار کلی کے نام سے موسوم ایک غیر مستند لوک کہانی کی داستانوی صورتیں ہیں۔ یہ رائے ایسے لوگوں کی ہے جو انار کلی کے توصیفی نام کے ساتھ فوری طور پر جذباتی ہو جاتے ہیں۔ میری عمر کے لوگوں کی نظر میں جنھوں نے اس ڈرامے کو اپنے بچپن میں پڑھا تھا، یہ ڈراما بچوں کو خوش کرتا ہے، جوانوں کو شہزادہ سلیم کے ساتھ محبت کرنا سکھاتا ہے اور پختہ عمر کے پڑھنے والوں کے لیے بے کار شئے ثابت ہوتا ہے۔ تاہم وہ نسل جس کے ساتھ امتیاز علی تاج نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی، "اس ڈرامے کو انگریزی ڈرامے کی روایت کے پس منظر میں دیکھتی ہے اور اسے اچھے یا بُرے ڈرامے کے طور پر زیر بحث لاتی ہے۔

عبد الحفیظ :

"امتیاز علی تاج ایک ایسے ادیب تھے کہ جنھوں نے زندگی بھر قلم اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑا جب تک وہ زندہ رہے۔ برابر لکھتے رہے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی ادب کی خدمت میں گزار دی۔ اردو ادب کو پروان چڑھانے میں ان کی خدمات کو ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بنیادی طور پر ایک ایسے فن کار ہیں کہ جن کا خاص میدان نثر کا میدان تھا۔ انھوں نے نثر کی کسی خاص صنف ہی کو اپنا موضوع بنایا بلکہ اس کے مختلف پہلوؤں پر لکھا اور بہت زیادہ لکھا۔ خاص طور پر نثر میں ڈرامے کو ترقی دینے اور عوام کو عروج پر پہنچانے میں ان کا نام بہت اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی بہت

سے ڈرامے لکھے کہ جو عوام میں بہت مقبول ہوئے لیکن ان کا ڈرامہ انار کلی ایک ایسا ڈرامہ ہے کہ جو ان کی تمام تصانیف پر بھاری ہے اور یہ ایک ایسا ڈرامہ ہے کہ جس کو اُردو ڈرامے کا سنگ میل قرار دیا جا سکتا ہے اور یہ ایک ایسا اعزاز ہے کہ جو ان کی موت کے بعد بھی ان کی یاد ہمیشہ زندہ رکھے گا۔"

پروفیسر حمید احمد خاں :

"سید امتیاز علی تاج کی محبوب شخصیت محض اعلیٰ درجے کے انسانی محلس کا مجموعہ نہ تھی، اُن کے ادبی اور فنی کمالات متنوع اور لا محدود تھے۔ وہ ہمارے اہلِ قلم کی اُس مختصر مگر ممتاز جماعت میں شامل ہیں جن کے نام کے ساتھ ہی اُن کا کام بھی ملک و قوم کی تہذیبی تاریخ میں زندہ رہے گا۔ یہ خصوصیت بہت کم اربابِ فن کو نصیب ہوتی ہے کہ فن کارانہ بصیرت کے ساتھ اُنھیں ایسا کاروباری سلیقہ بھی ودیعت ہوا ہو جس سے دل و دماغ کو جلا دے کر ادبی تخلیق اور ادبی تنظیم دونوں میدانوں میں کارہائے نمایاں سر انجام دے جائیں۔ سید امتیاز علی تاج کے کارنامے "انار کلی" یا اُردو کے کلاسیکی ڈرامے کے تیس پینتیس مجلدات پر ختم نہیں ہوتے۔ سب کو معلوم ہے کہ اُنھوں نے اپنی ادبی فتوحات کے ساتھ دار الاشاعت پنجاب اور مجلس ترقی ادب کی بھی تخلیق کی۔ ان اداروں کا کام مرحوم کے تخیل کی شادابی اور حسنِ ایجاد و اہتمام کی بدولت زندہ جاوید رہے گا۔"

زیڈ۔ اے۔ بخاری :

"لاہور میں ابھی ریڈیو جاری نہ ہوا تھا، مگر سالک اور امتیاز علی تاج کے بغیر

محفل سوئی ہو جاتی۔ چنانچہ انتظام یہ کیا گیا کہ یہ حضرات لاہور سے ٹیلی فون پر بولیں اور ہم دہلی سے ان کی تقریریں ریلے کریں۔ مالک صاحب "افکار و حوادث" اور امتیاز علی تاج صاحب "چچا چھکن" لے کر اس بزم میں شریک ہوئے۔"

ڈاکٹر جمیل جالبی :

" تاریخ ادب میں ڈراما "انار کلی" کا مقام یہ ہے کہ وہ اُردو میں اپنی قسم کی ایک ہی چیز ہے۔ ہمارے اُردو فارسی اور عربی ادب میں ڈرامے کی کوئی روایت نہیں ہے۔ زیادہ تر ادب میں ڈرامائی عنصر سے گریز نظر آتا ہے۔ قصہ اور غزل ڈرامے سے متضاد مزاج رکھتے ہیں۔ مثنوی میں بھی مبالغہ آمیزی کسی حالت یا کردار کو ڈرامائی نہیں ہونے دیتی۔ تاج صاحب بھی اسی روایت کے آدمی تھے۔ اُن کے ڈرامے کا اثر غنائی ہے حالانکہ وہ نثر میں لکھا گیا ہے۔ سارے پُر اثر سین جذباتی ہیں۔ جذباتی مکالمات پر ہی اُنھوں نے سب سے زیادہ زور صرف کیا ہے۔ اُن کو ڈرامائی ماننے میں وہ اپنی روایت سے الگ ہو جاتے ہیں اور یورپ کی روایت سے قریب تر آجاتے ہیں۔ اس طرح اس ڈرامے میں ایک ایسا امتزاج وجود میں آجاتا ہے کہ جو اُسے فرانس کے انیسویں صدی کے ڈراما نگاروں سے قریب لے آتا ہے۔ ہیوگو اور دگنی (Vigny) کے ڈرامے کچھ ایسا ہی تاثر پیش کرتے ہیں۔

ایک اہم تحریر

سید امتیاز علی تاج

گورنمنٹ کالج ڈرامیٹک کلب

شخصیتیں، یادیں اور خدمات

میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ۱۹۱۵ء میں داخل ہوا تھا۔ اس زمانے میں پروفیسر شیخ نورالٰہی مرحوم گورنمنٹ کالج ڈرامیٹک کلب کے پریذیڈنٹ اور شیخ امتیاز علی مرحوم سیکرٹری تھے۔ کلب وہ ہی کھیل اسٹیج کرتی تھی جو اس زمانے کی تھیٹریکل کمپنیوں میں عام طور سے پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اپنے اسکول کے زمانے میں مجھے گورنمنٹ کالج ڈرامیٹک کلب کا ایک کھیل اسیر حرص دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ مختلف تھیٹروں کے بہت سے کھیل دیکھ چکا تھا لیکن کلب کے کھیل میں سازوسامان معمولی ہوتے ہوئے ایسی چشتی و شتسگی نظر آئی تھی جو اس زمانے کے صرف اعلیٰ تھیٹروں میں دکھائی دیتی تھی۔ چنانچہ گورنمنٹ کالج میں داخل ہو جاتے سے مجھے بہت زیادہ خوشی اس بات کی بھی تھی کہ یہاں ڈرمیٹک کلب کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا موقع میسر آسکے گا۔

۱۹۱۶ء میں کالج ڈے کے موقع پر پیش کرنے کے لیے آغا حشر کا کھیل صید ہوس منتخب کیا گیا۔ اس کے ساتھ کامک، زہری سانپ سے لینا قرار پایا۔ پارٹ

تقسیم کرنے کے لیے ایک دن شام کے وقت کالج ہال میں میٹنگ کی گی۔ میں بھی اس میٹنگ میں پہنچا۔ فرسٹ ایر کا طالب علم تھا، مجھے ابھی یہ بھی معلوم نہ ہونے پایا تھا کہ کالج کی اُونچی جماعتوں میں کون لوگ پڑھتے ہیں اور کس چیز میں کیا پایہ رکھتے ہیں۔ میٹنگ میں دیکھا کہ بڑا بڑا جغادری دلجمعی اور اعتماد سے بیٹھا ہے، جان پہچان کے لوگوں نے سرگوشیوں میں بتایا کہ ان میں سے کون کون ہے۔ شیخ صاحب صید ہوس کے مختلف پارٹ اُمیدواروں سے پڑھوا کر سن رہے تھے، مجھے خوبی جانتے تھے، مجھ پر نظر پڑی تو بولے ارے کرے گا کوئی پارٹ؟ عرض کیا حاضر تو اسی نیت سے ہوا ہوں، بولے تو پڑھ کر سنا اقبال کا پارٹ۔ اُونچی جماعتوں کے تجربہ کار ایکٹروں کے سامنے ایک نووارد کا چراغ جلنے کی کیا اُمید ہو سکتی ہے، مگر میں پارٹ پڑھ رہا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ حاضرین کے انداز میں استہزا نہیں بلکہ دلچسپی اور ہمدردی ہے، چنانچہ بتدریج میرا حوصلہ بڑھتا گیا۔ آزمائش ختم ہوئی تو حاضرین میں سے اکا دکا نے تالی بھی پیٹ دی۔ شیخ صاحب نے کسی قسم کی اظہار رائے کیے بغیر نادر کی بیٹی اقبال کے پارٹ کے لیے مجھے انتخاب کر لیا۔

پارٹ تقسیم ہو چکے تو کالج ہال میں ریہرسل شروع ہوئی۔ اس زمانے میں شام کے مجمع بڑے مفرح اور بارونق ہوتے تھے۔ کاسٹ تو ہوتی ہی تھی، بڑی جماعتوں کے کئی دوسرے طالب علم جو تماشے کے موقع پر اسٹورڈ وغیرہ کی خدمت سر انجام دیتے، شروع ہی سے بلاناغہ ریہرسل میں آنے لگتے۔ ہر روز اچھا خاصا مجمع ہو جاتا۔ دلچسپی کا مرکز شیخ صاحب کی اپنی ذات تھی۔ لمبے قد اور کمائے ہوئے چوڑے چکلے جسم کے مالک تھے۔ ساری عمر صبح کے وقت کئی کئی سوڈنٹر پیلنے کا معمول رہا۔ کھانا بھی بہت پر تکلف کھاتے تھے، جسم کیوں کر نہ بنتا۔ غیر معمولی طور پر خلیق اور خوش طبع واقع ہوئے تھے۔ اکثر طلبا کا ان سے کم و بیش اپنے خاندان کے بے تکلف بزرگوں کا سا تعلق تھا۔ شیخ صاحب بھی ان کے دکھ سکھ کے شریک رہتے، جس سے بے تکلف ہوتے اسے

تو کہہ کر مخاطب کرتے۔ آواز میں کڑک تھی مگر آواز سینے سے نہ نکالتے تھے، حلق سے نکلتی معلوم ہوتی تھی۔ لہجے میں قدرے تکلف تھا، پورے پورے لفظ جیسے احتیاط سے ادا کرتے تھے، البتہ قہقہہ بہت بے تکلف اور پارٹ دار پایا تھا، سینے کی گہرائیوں سے نکلتا معلوم ہوتا تھا۔ جی۔ سی۔ ڈی۔ سی کے تقریباً سب ممبروں سے بہت بے تکلف تھے مگر بے تکلف ہوتے ہوئے بھی اپنا رعب قائم رکھنا جانتے تھے، غصے میں بہت کم آتے تھے، بعض اوقات بگڑتے تو خفا ہوتے ہوتے قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے تھے۔ غرض ان کی شخصیت بہت محبوب و دلکش واقع ہوئی تھی۔ میں جب کالج میں آیا تو سوٹ پہنتے تھے، کوٹ اس کا ذرا لمبا رکھواتے، بعد میں سوٹ پہننا بالکل ترک کر ڈالا، چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی پہننے لگے، شیروانی گھٹنوں سے ذرا نیچے رکھتے۔ سر پر جناح کیپ کی وضع کی ٹوپی پہنتے تھے۔

شیخ صاحب ریہرسل کا آغاز عموماً اس متانت و سنجیدگی سے کرتے گویا کھیل کی تیاری کا بیشتر کام آج ہی ختم کر کے دم لیں گے۔ جانتے تھے کاسٹ کے کئی ممبران سے بے تکلف ہیں چنانچہ ان کی بے تکلفی کو عناں گیر رکھنے کے لیے اسکرپٹ پر یا سامنے ایکٹروں پر نظر رکھ کر ایسا ظاہر کرتے گویا کام سے کام رکھنے پر تلے ہوئے ہیں، کسی غیر متعلق بات یا خلل اندازی کے روادار نہیں۔ اور دیوان شرر، شیخ امتیاز علی اور بڑی جماعتوں کے بعض دوسرے طلبا جیسے اس تاک میں بیٹھے رہتے کہ کب موقع ملے جو ضابطے اور قاعدے کی اس فضا کو درہم برہم کریں۔ کوئی ایکٹر پارٹ غلط پڑھتا یا لہجے کی کوئی غلطی کر بیٹھتا تو فی الفور ادھر سے ایک فقرہ کسا جاتا۔ فقرے کا سُر ایسا رکھا جاتا کہ زیرِ لب معلوم ہوتے ہوئے بھی شیخ صاحب کے کان تک بہر حال پہنچ جائے۔ حاضرین دبی ہنسی ہنستے اور شیخ صاحب ان سنی کر جاتے، مگر ان کی ذرا دیر کی خاموشی چغلی کھا جاتی کہ ہنسی دبانے کو اندرونی جدوجہد در پیش تھی، یہ اشارہ ہوتا اس نوع کی مساعی کو دو چند کر دینے کا۔ نتیجہ بالآخر یہ نکلتا کہ شیخ صاحب پھٹ کر ہنس پڑتے۔ ہنستے جاتے اور فقرہ

کہنے والے سے کہتے جاتے نامراد! میں تجھے کلب سے قطعی نکال دوں گا۔ بس اتنے میں فضا بدل جاتی، ریہرسل زیادہ بے تکلفانہ انداز اختیار کر لیتی۔ کاسٹ کے جن لوگوں نے پچھلی شام کے وعدے کے مطابق پارٹ زبانی یاد نہ کیا ہوتا یا اپنی سطور کے لہجے پر توجہ نہ کی ہوتی، انھیں اپنے عذر کی شنوائی کے متعلق کوئی تردد نہ رہتا۔ ریہرسل سے زیادہ محفل آرائی شروع ہو جاتی، لطیفے کہے جاتے، پچھلے ڈراموں کے واقعات بیان ہوتے، کاسٹ کے کسی ممبر میں کوئی امکان نظر آتا تو اسے بنایا جاتا۔ ریہرسل ختم کرتے وقت پھر ذرا دیر کو متانت کا سماں بندھتا، وقت ضائع جانے پر دلی قلق کا اظہار کیا جاتا، زیادہ متاسف وہی نظر آتے جو فضا بدلنے کے ذمہ دار ہوتے۔ اگلے روز کے لیے شد و مد سے نئے ارادے بنتے، تاکیدیں ہوتیں، پارٹ پر توجہ اور سطور یاد رکھنے کے متعلق بڑی سنجیدگی سے سینے پر ہاتھ مار مار کر وعدے کیے جاتے۔

کھیل پیش کرنے کے دن قریب آئے تو سماں بدل گیا۔ ریہرسل میں شیخ صاحب کی آواز بہت زیادہ بلند ہو گئی اور اکثر سنائی دینے لگی۔ نامراد! اور ستیاناس کر ڈالا ہے پارٹ کا اور میں تجھے قطعی نکال دوں گا بار بار سننے میں آنے لگا۔ زیادہ دیر میں آنے والوں پر شیخ صاحب اپنی چھڑی اُٹھا کر۔۔ لگے۔ عادی مجرموں کو عذر تراشی میں زیادہ طباعی سے کام لینے کی ضرورت محسوس ہونی شروع ہو گئی۔ ریہرسل کے اوقات بڑھ گئے۔ ریہرسل سے لوٹتے وقت شیخ صاحب کے جلوس کے لوگ گھر والوں کے سو چکنے اور رات کو کھانا نصیب نہ ہونے کے اندیشے ظاہر کرنے لگے۔ جواب میں شیخ صاحب کی طرف سے اپنے ہاں کھانا کھا لینے کا مشورہ ملنے لگا۔ اندیشوں کا یہ اظہار کیا ہی اس۔۔۔ کی اُمید میں جاتا تھا مگر یہ کبھی کسی کی سمجھ میں نہ آسکا کہ شیخ صاحب کے ہاں بغیر کسی نوٹس کے رات گئے تک فی الفور کئی لوگوں کے لیے پر تکلف کھانے کا اہتمام کیسے ہو جاتا تھا اور دستر خوان پر ہرن کے کباب عموماً موجود ہونے کا بھید کیا تھا۔ جب کبھی شیخ صاحب سے اس کے متعلق استفسار کیا جاتا تو وہ قہقہہ لگا کر فرماتے ارے کمبخو! اب تمھیں کھانا بھی

کھلاؤں اور ساتھ ہی یہ بھی بیان کروں کہ میرے ہاں کون سی چیز کہاں سے آتی ہے ؟

آخری دنوں کی ریہرسلیں بڑے ہنگامے کی تھیں۔ سارا سال سرگرمیوں کا میدان بن گیا تھا۔ اسٹیج پر ریہرسل ہو رہی ہے، ہال کے ایک کونے میں طبلہ کھڑک رہا ہے، ہارمونیم اور سارنگی کی دل نواز آوازیں آ رہی ہیں، میوزک ماسٹر گانوں کی تعلیم دینے میں مصروف ہے، آس پاس کن رسیا لڑکوں کا ہجوم ہے۔ دوسری طرف درزی لباس پہنا پہنا کر دیکھ رہا ہے، اس پر شدومد سے نکتہ چینی ہو رہی ہے : اس جگہ لباس چست ہونا چاہیے،، یہاں اس پر کوئی کام بنانے کی ضرورت ہے۔ پاس ہی کوئی ہمت کا دھنی شہر کے تھیٹر سے بہت سے لباس مستعار لے آنے میں کامیاب ہو گیا ہے، ان کی گٹھڑی کھولے بیٹھا ہے اور اپنی محنت نیک لگنے کو مصر ہے کہ تھیٹر کے لباس زیادہ موزوں رہیں گے۔ انار کلی میں ڈاکٹر اقبال کے پرانے بالاخانے کے نیچے ایک ہیئر کٹنگ سیلون تھا، اس کے مالک حبیب میک اپ کے سلسلے میں آن پہنچے ہیں اور وگ پہنانے میں لڑکوں کے سروں سے زور آزمائی کر رہے ہیں۔ کلب کی ایک بڑی کارآمد ہستی بندے حق تھی۔ وہ اسٹیج کا ضروری سامان فراہم کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ بزرگ نہ جانے کب کلب سے وابستہ ہوئے تھے۔ اسٹیج لگانا، اسے سین سینری سے فٹ کرنا، پردے اُترنے چڑھنے کا بندوبست، ضرورت کے مطابق نئے پردوں اور پراپرٹی کی تیاری، سب کام اُن کے ذمے تھے اور وہ ان سب کاموں کے اتنے ماہر بن چکے تھے کہ بس ضرورت انھیں بتا دیجیے اور بے فکر ہو جائیے۔ بندے حق کی ہمہ دانی مناسب وقت پر سب کام اطمینان بخش طور پر سر انجام دے لیتی تھی۔

کھیل مقررہ تاریخوں تک خاطر خواہ طور پر تیار ہو کر سٹیج ہو گیا اور توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ پہلی رات کا کھیل صرف اپنے کالج کے طلبا کے لیے کیا جاتا تھا، دوسری رات کا یونیورسٹی کے طلبا کے لیے اور تیسری رات کا کھیل مہمانوں کے لیے۔ تینوں راتوں میں کھیل کی داد خوب ملی۔ ان دنوں نیو البرٹ تھیٹر بھی شہر میں موجود تھا۔

اس کا مالک، مینیجر، ڈائریکٹر اور چند نامور ایکٹر بھی کھیل دیکھنے آئے اور عقیدت مندانہ انداز میں کھیل کو سراہتے رہے۔ کھیل کی مکمل کاسٹ تو مجھے یاد نہیں، اتنا خوب ہی یاد ہے کہ بڑے پارٹوں میں کون سا پارٹ کس نے کیا تھا۔ نادر کا پارٹ عطا محمد مرحوم نے کیا تھا۔ یہ ان دنوں کالج کے اولڈ بوائے کی حیثیت رکھتے تھے۔ بھرے جسم کے قد آور اور وجیہہ جوان تھے، ناک نقشے کے بہت اچھے، آنکھوں میں دل کشی تھی، آواز میں قوت اور پھر بڑی بات یہ کہ شخصیت کے مالک تھے، سٹیج پر قدم دھرتے تو دل بے اختیار کہتا کہ کوئی آیا ہے۔ شیخ صاحب خود قزل بنے تھے۔ شیخ صاحب پارٹ بڑی سمجھ سے کرتے تھے، لچک البتہ کم تھی۔ لڑکوں کے ساتھ سٹیج پر آکر کسی قدر جھینپتے بھی رہتے تھے۔ اسی لیے سٹیج پر ان کی شخصیت دب سی جاتی تھی۔ تھیٹر کی رسم کے مطابق قزل کے پارٹ میں میک اپ سے چہرہ سیاہ نہ کیا تھا پھر بھی پارٹ کو خوبی نبھایا اور خوب داد لی۔ منجر کا پارٹ رفیع پیر نے کیا تھا۔ یہ مجھ سے ایک جماعت اوپر تھے، ان کا میر اسنٹرل ماڈل سکول سے ساتھ تھا۔ ڈرامے سے غیر معمولی شغف رکھتے تھے۔ انھیں پارٹ ایسا نہ ملا تھا جس میں ان کے کمالات پوری طرح اجاگر ہو سکتے لیکن ان کے سلیقے نے پارٹ کو حتی الامکان جان دار بنانے میں کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ شاہ دارا کا پارٹ لطف الرحمان صاحب نے کیا تھا۔ یہ صاحب ایک مختصر سی سنہری داڑھی کے مالک واقع ہوئے تھے۔ کاسٹ کے بعض ممبر بیان کرتے تھے کہ تماشا ختم ہونے کے بعد میک اپ کرنے والا بھولے سے اس داڑھی کو اتارنے کے درپے ہو گیا تھا اور اسی کشاکش کے باعث اس کے اور رحمان صاحب کے تعلقات مستقل طور سے کشیدہ ہو گئے تھے۔ قیصر کا پارٹ بہت مختصر قد کے میرے ایک ہم جماعت حکم چند نے کیا تھا۔ کھیل میں کئی بار اپنی امی کو مخاطب کر کے یہ حضرت سارے کالج کے نور نظر بن گئے تھے۔ شیر جنگ کا پارٹ ایک صاحب نہل چند نے ادا کیا تھا۔ ان کے کام میں پیشہ ور سٹیج کا رنگ غالب تھا۔ مردانہ پارٹ بیان کرتے ہوئے کہیں راجہ غضنفر علی کو نہ بھول جاؤں۔ انھوں نے صید ہوس میں قاتل کا اور

کومک میں ایک برقع پوش جن کا چھوٹا سا پارٹ کیا تھا۔ راجا کو پارٹ دینے میں کلب نے کسی قسم کی قدر دانی کا ثبوت کبھی نہ دیا۔ تلچھٹ کے طور پر کھیل کا جو پارٹ بھی بچ رہتا وہ بلا تکلف راجا کے سر تھوپ دیا جاتا تھا اور اس سلسلے میں یہ غور کرنے کی ضرورت بھی نہ سمجھی جاتی تھی کہ وہ اسے کرنے کو رضامند ہیں یا نہیں۔ ادھر کلب سے راجا کی وفا شعاری کا بھی یہ عالم کہ ہر چہ از دوست می آید نیکوست، جو پارٹ بھی ملتا اسے لے کر پھولے نہ سماتے، سر آنکھوں پر جگہ دیتے۔ انھیں پارٹوں سے زیادہ کلب سے وابستہ رہنے میں دل چسپی تھی، یعنی۔۔۔ سے غرض نشاط نہ تھی، ایک گونہ بے خودی تھی۔

زنانہ پارٹوں میں مہر عالم کا پارٹ شیخ محمد نصیر نے کیا جو پنجاب اسمبلی کے اسٹنٹ سیکریٹری تھے اور بڑے تاثر اور جوش و خروش سے کیا۔ ان کی بیٹی اختر کا پارٹ پروفیسر حمید مرحوم سلیقے سے کر گئے۔ باقی اقبال کا میں خود کر رہا تھا۔ میری عمر اس وقت پندرہ سال سے کچھ ہی اوپر تھی۔ مجھے اسٹیج پر دیکھ کو ناواقفوں کو کسی طور پر یقین نہ آتا تھا کہ لڑکا لڑکی کا پارٹ کر رہا ہے۔ مہمانوں کی رات کئی یورپین خواتین مجھ سے ملنے گرین روم تشریف لائیں اور حیرت و استعجاب کی طرح طرح کی چیخیں مار کر میرے لڑکیوں کے سے انداز کی تعریفیں کرتی رہیں۔ کالج میں بے شمار عشاق پیدا ہو گئے۔ ہر روز اسٹیج پر جاتے وقت گلدستوں کے تحائف آنے لگے۔ اپنے کالج تک تو خیریت تھی، دوسرے کالجوں سے بھی کھانے اور چائے کے بلاوے آگئے۔ ایک صاحب نے خدا انھیں غریق رحمت کرے اپنے پر زور بلاوے کے ساتھ ایک بزرگ کی سفارش بھی شامل کر دی تو میں ان کے ہاں چائے پر چیف کالج چلا گیا۔ ان کے کمرے میں پہنچ کر دیکھا کہ چائے کے بہت پر تکلف سامان سے میز تو بجی ہوئی ہے مگر میزبان خود غائب ہیں اور ان کے واپس آنے کی کوئی امید بھی نہیں۔ ان کے ملازم نے بے حد اصرار کر کے مجھے چائے پلا دی اور میں چائے پی کر حیران ہوتا ہوا چلا آیا۔ بعد کی زندگی میں جب میرے ان صاحب سے مراسم بڑھے تو ایک روز کہنے لگے: بتا نہیں سکتا کتنا اشتیاق تھا اس روز تم سے ملنے کا لیکن

عین وقت پر ہمت کچھ اس طرح جواب دے گئی کہ مجبوب ہو کر بھاگ کھڑے ہونے کے سوا چارہ نظر نہ آیا اور تمھارے چلے جانے کے بعد اپنی اس حماقت کا اس درجہ افسوس ہوا کہ عرصے تک اپنے آپ کو ملامت کرتا رہا۔

میں نے چائے کے اس انوکھے بلاوے کا ذکر ڈرامیٹک کلب کے اپنے احباب سے کیا تو انھوں نے یہ بات شیخ صاحب تک پہنچادی۔ شیخ صاحب نے مجھے طلب کیا اور بگڑ کر بولے: یہ میں تیرے چیف کالج چائے پر جانے کا کیا ذکر سن رہا ہوں، اگر پھر کبھی کسی ایسے بلاوے پر گیا تو میں تجھے کلب سے قطعی نکال دوں گا۔ اس قسم کی باتیں چھڑ گئی ہیں تو اتنا اور بتادوں کہ اس زمانے میں کلب کے پریذیڈنٹ اپنی ذمہ داری کس قدر محسوس کرتے اور کلب کے ممبروں کی عام روش کا خیال کتنا زیادہ رکھتے تھے۔ ایک روز میں کالج ہال کے سامنے سے گزر رہا تھا، مجھے مطلق احساس نہ تھا کہ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہا ہوں، اسی وقت سامنے سے شیخ صاحب ہمیشہ مشفقانہ پیش آتے تھے لیکن اس وقت میری چال کو دیکھ کر بہت ہی ناگوار لہجے میں بولے یہ تیری چال کو کیا ہو گیا ہے، عورتوں کا پارٹ کر کر کے عورت بن جانے کا ارادہ ہے؟ مردوں کی طرح بڑے بڑے قدر اٹھا کر کیوں نہیں چلتا؟ اس روز سے لمبے لمبے ڈگ بھرنے کا خاص خیال رکھا۔ بڑی جماعتوں میں پہنچنے کے بعد بھی کبھی کبھی شیخ صاحب سے پوچھ لیا کرتا تھا اب تو چال ٹھیک ہے نا شیخ صاحب؟ وہ جواب میں صرف نامراد فرمادیا کرتے تھے۔

ہاں تو ان باتوں میں کھیل کے کامک کا ذکر تو رہ گیا؛ اس زمانے میں شیخ امتیاز علی مرحوم اور دیوان آنند شرر، یہ دو حضرات ڈرامیٹک کلب نے ایسے باکمال پیدا کر دیے تھے کہ نامی پیشہ ور تک ان کے معترف تھے۔ امتیاز علی کامک پارٹ اس ساختہ بے ساختگی اور انہماک سے کرتے تھے کہ ان کی متانت کے نتائج نہایت ہی مضحک نظر آنے لگتے، بڑا بڑا زاہد خشک بھی پھٹ کر ہنس پڑتا تھا۔ کام میں اتنی منتخب اور ستہ حرکات ہوتیں اور لہجہ ایسا نچا تلا رکھتے جو ایک ادنیٰ پارٹ میں بھی جان ڈال دیتا تھا۔ امتیاز

مرحوم نے اس کامک میں نوشہ میاں کا پارٹ ادا کیا تھا۔ یہ پارٹ کسی زمانے میں بمبئی کی پارسی تھیٹریکل کمپنی کا ایک ایکٹر اشرف بڑی خوبی سے ادا کرتا تھا لیکن جن لوگوں نے اشرف اور امتیاز دونوں کے پارٹ دیکھے ان کا خیال تھا کہ امتیاز، اشرف سے بازی لے گیا ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی کا پارٹ آتم آنند شرر نے کیا تھا، انھیں اسٹیج پر ہنگامہ برپا کرنا بہت مرغوب تھا، اپنے کریکٹر کا مطالعہ ہی کچھ اس نظر سے کرتے تھے کہ اس میں ہنگامہ پیدا کرنے کا امکان کہاں کہاں ملے گا، لیکن باجود ہنگامہ پسندی کے ارزاں یا مبتذل کبھی نہ ہوتے۔ وطن ملتان تھا لیکن زبان بہت صاف پائی تھی، لہجے پر خوب قابو تھا۔ اتنے بے تکلف زندگی میں نظر نہ آتے تھے جتنے اسٹیج پر دکھائی دیتے تھے۔ اس کھیل کے کامک میں یہ ایک نقلی ناک لگا کر ڈاکٹر غلام جیلانی کا پارٹ کرتے تھے۔ اتفاق کی بات ایک رات تماشے میں یہ نقلی ناک سب کے سامنے سٹیج پر گر گئی۔ شرر ذرا دیر تو بھونچکا سے رہ گئے کہ اب کیا کریں گے لیکن پھر فوراً ہی سنبھلے، جھک کر ناک کو اٹھا لیا، کبھی غور سے الٹ پلٹ کر اسے دیکھتے، کبھی ایک حیرت اور خوف کے عالم میں اپنی اصلی ناک کو چھو کر دیکھتے کہ کیا واقعی اس کا کوئی جیتا جاگتا حصہ جدا ہو گیا ہے۔ وقت کے وقت انھوں نے مضحکہ خیز کام کیا کہ نقلی ناک گرنے سے جو ایک شور سا اٹھا تھا وہ مسلسل قہقہوں میں ڈوب کر رہ گیا۔ حمید کا پارٹ شیخ حسام الدین مرحوم نے کیا تھا۔ یہ کالج میں اپنی خوش پوشاکی کی وجہ سے مشہور تھے، بہت نفاست سے بن سنور کر کالج آتے تھے۔ حمید کے پارٹ کے بعد ان کا نام خاندانی ایکٹر پڑ گیا تھا۔ یہ نام ان کا یوں پڑا کہ ایک روز ریہرسل میں جو کچھ شیخ صاحب چاہتے تھے وہ کسی طرح ان سے ادا نہ ہوتا تھا۔ بہت دیر تک کوشش ناکام رہنے کے بعد آخر یہ جھنجھلا اٹھے اور بگڑ کر بولے شیخ صاحب! میں کوئی خاندانی ایکٹر تو ہوں نہیں جو آپ اس قسم کے کام کی امید مجھ سے رکھتے ہیں۔ اکبری کا پارٹ بلونت نے اور کلثوم کا جسونت نے کیا تھا۔ بلونت جسونت بھائی تھے، دونوں خوب گاتے تھے مگر جسونت کی آواز میں رس تھا، تماشے میں ان کے گانے بہت مقبول

ہوئے۔

اس زمانے میں تماشے میں بہترین کام کرنے والوں کو میڈل بھی ملے تھے۔ اس کھیل میں بہترین مردانہ کھیل کرنے کے میڈل غالباً عطا اور امتیاز کو ملے تھے اور بہترین زنانہ پارٹ کرنے کا میڈل جسونت کو ملا تھا۔ کھیل کے بعد ساری کلب ایک روز جہانگیر کے مقبرے پر گئی۔ وہاں سارا دن گانے جانے، کھیل کے واقعات بیان کرنے، ہنسنے بولنے اور کھانے پینے میں صرف ہو گیا۔

اگلے سال کلب نے پیش کرنے کے لیے گورکھ دھندا کو کھیل منتخب کیا، یہ شکسپیئر کے کھیل اے کامیڈی آف ایررز سے اخذ کر کے لکھا گیا۔ پسند پنڈت نارائن پرشاد بیتاب آنجہانی کی تھی۔ جب اس کے پارٹ تقسیم ہوئے، میں علیل تھا، تندرست ہو کر کالج پہنچا تو ریہرسل شروع ہو چکی تھی۔ شیخ صاحب نے مجھے ریہرسل میں دیکھا تو بولے کمبخت اب آیا ہے جب کھیل کی ریہرسل ہو چکی ہے، اب تجھے پارٹ کہاں سے دوں میں نے کہا کچھ کیجیے ورنہ میرا یہ سال اکارت چلا جائے گا۔ کہنے لگے اکارت تو جب کہیو اگر فیل ہو گیا۔ میں نے جواب دیا شیخ صاحب پڑھنے لکھنے کا معاملہ تو میرے اور اللہ میاں کے درمیان ہے، اس کا ذکر نہ کیجیے، پارٹ کا معاملہ میرے اور آپ کے درمیان ہے، اس کا بندوبست فرمایئے بولے چھوٹے انٹونیو کا پارٹ میں نے بلونت کو دیا ہے، وہ بیمار ہو کر گجرات چلا گیا ہے، وہ اگر نہ آیا تو یہ پارٹ میں تجھے دے دوں گا۔ بلونت کی بیماری کے طول کھینچنے کی دعائیں خضوع و خشوع سے مانگیں مگر وہ ایسی سخت ہڈی تھی کہ چند ہی روز میں تندرست ہو آن موجود ہوا۔ میں نے پھر شیخ صاحب کو گھیرا کہ بلونت تو آگئے، میں اب کیا کروں۔ شیخ صاحب نے کہا تو ڈراما لکھنے کا شوق بھی رکھتا ہے، ایک چھوٹا سا ڈراما اپنے لیے آپ کیوں نہیں لکھ لیتا۔

شیخ صاحب سے حکم ملنے کی دیر تھی کہ میں ایک ایکٹ کا ڈراما لکھنے میں غرق ہو گیا۔ سجاد حیدر کی خیالستان سے نکاح ثانی کے افسانے کو سامنے رکھ کر جھٹ پٹ ایک

کھیل تیار کر لیا۔ شیخ صاحب کو سنایا تو انھیں پسند آیا، چنانچہ گورکھ دھندا کے ساتھ اس کی ریہرسل بھی شروع ہو گئی۔ جب گورکھ دھندا کا کھیل سٹیج ہوا تو اس کے بعد یہ بھی پیش کیا گیا۔ گو کئی اعتبار سے خاصا کمزور کھیل تھا لیکن ایک تو اس زمانے میں ایک ایکٹ کا کھیل کبھی ہوا نہ تھا، دوسرے اس کا انداز حقیقت پسندانہ تھا اور تیسرے اس زمانے کے تماشائیوں کو زیادہ سمجھ کہاں تھی، انھوں نے بہت پسند کیا۔ گورکھ دھندا میں پرانے لوگوں کے ساتھ تین نئے لوگ اسٹیج پر آئے؛ ایک تو پنڈت پوتار لال بقایا، انھوں نے کھیل کی ہیروئن ایڈا کا پارٹ کیا تھا اور سچ یہ ہے کہ خوبی اور بے تکلفی سے کیا تھا۔ آواز شیریں، تلفظ اور لہجہ دہلوی، حرکات شستہ، مدت کے منجھے ہوئے ایکٹر معلوم ہوتے تھے۔ دوسرے صاحب احمد یار خاں دولتانہ تھے۔ انھوں نے پولیس کے ایک افسر کا پارٹ کیا تھا۔ پارٹ ملنے کے متعلق ان کا نقطہ نظر بہت تندرست تھا۔ کہا کرتے تھے: کھیل میں اس بات کا خیال بالکل نہ کرنا چاہیے کہ پارٹ لمبا ملا ہے یا چھوٹا، بس اتنا غنیمت سمجھنا چاہیے کہ پارٹ مل گیا۔ تیسرے صاحب جو اس کھیل میں پہلی بار اسٹیج پر آئے وہ احمد شاہ بخاری تھے۔ انھیں ایک قاتل کا پارٹ ملا تھا جو لائبریری میں بادشاہ کے قتل کے لیے بھیجا جاتا ہے لیکن جب وار کرنے کو ہاتھ اٹھاتا ہے تو جمیز کے ہاتھوں جس کا پارٹ شیخ نور الٰہی کر رہے ہیں، خود گولی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ بخاری بیچارے سے اس کھیل میں بڑی زیادتی ہوئی۔ پارٹ میں کچھ بولنا تو تھا نہیں، حرکات ہی حرکات تھیں، چھپتے چھپاتے داخل ہونا، کرسی کی آڑ لینا، اٹھنا، دبکنا، رفتہ رفتہ بادشاہ تک پہنچنا اور قتل کے لیے چھری اٹھانا، بخاری نے اپنی ہر ہر حرکت کئی کئی طرح سوچ کر ان میں سے بہترین منتخب کر لی تھی۔ تماشے میں ان کے پارٹ کا وقت آیا تو مجھے کہا ذرا ونگ میں کھڑے ہو کر دیکھتے رہنا، میں آج کیا کرتا ہوں، چنانچہ نہ صرف میں بلکہ ان کے کئی اور احباب بھی ان کا کام دیکھنے ونگ میں آن موجود ہوئے۔ بخاری صاحب سٹیج پر بڑی خوبی سے داخل ہوئے اور بڑی صفائی سے ایک کرسی کی اوٹ میں ہو گئے، یہاں سے انھوں نے یہ دیکھنے کے

لیے سر اٹھایا کہ بادشاہ جاگ رہا ہے یا پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھ لگ گئی ہے۔ پوری طرح اپنا اطمینان بھی نہ کرنے پائے تھے کہ شیخ صاحب نے جھٹ داخل ہو زن سے پستول چلا دیا، لیجیے چھٹی ہو گئی۔ پستول جل چکا تھا۔ اب عثاری کے لیے اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ دل کی دل میں لیے پٹ سے سٹیج پر گر پڑیں۔ سین ختم ہوا تو بڑے منغض باہر آئے۔ شیخ صاحب سے شکوہ کیا کہ آپ نے پستول چلا کر مجھے کچھ کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ وہ بے فکری سے بولے ارے نہیں، بہت ہو لیا تھا ایکٹنگ، خوب پارٹ کر گیا ہے کمبخت اگلے دونوں دن اسٹیج پر جانے سے پہلے عثاری نے خاص طور پر شیخ صاحب سے کہا دیکھیے آج پستول چلانے میں تعجیل سے کام نہ لیجیے گا۔ شیخ صاحب نے دونوں روز پختہ وعدہ کیا لیکن عین وقت پر نہ جانے انھیں کیا ہو جاتا تھا کہ بے صبر ہو کر فوراً پستول چلا بیٹھتے تھے۔ باقی کی دونوں راتوں کو بھی عثاری دل کی حسرتیں دل ہی میں لیے سفر آخرت اختیار کرتے رہے۔

جی۔ سی۔ ڈی۔ سی کے اس دور کا آخری کھیل خواب ہستی، مصنفہ آغا حشر تھا جو کلب نے اگلے سال کشمکش کے نام سے سٹیج کیا۔ یہ کھیل اس درجہ کامیاب رہا کہ ساری یونیورسٹی میں اس کی دھوم مچ گئی۔ غیر معمولی کامیابی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کی کاسٹ بہت اچھی اور موزوں تھی۔ صولت کے پارٹ کے لیے کالج کے اولڈ بوائے حکیم احمد شجاع صاحب کو مدعو کیا گیا۔ ان کے شباب کا زمانہ تھا، اس رعنائی سے پارٹ کر گئے کہ لوگ مدتوں یاد کرتے رہے۔ ایک روز پارٹ کرتے کرتے انھیں نامعلوم کیا ہوا کہ ساری کلب کو عموماً اور شیخ صاحب کو خصوصاً پریشان کر ڈالا؛ سین میں ان کے حضور گانا ہو رہا تھا۔ پنڈت جیون لال مٹو سامنے بیٹھے گا رہے تھے، انھیں صرف ایک گانا گانا تھا لیکن حکیم صاحب کچھ ایسے مزے میں آئے کہ پہلا گانا ختم ہوا تو دوسرے کی فرمائش کر دی، وہ ختم ہوا تو تیسرے کی پھر چوتھے کی، ونگ میں سب کے سب پریشان کھڑے حکیم صاحب کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر حکیم صاحب کہاں کسی کی سنتے

تھے۔ شیخ صاحب بے کلی کے مارے جھنجھلا جھنجھلا کر کہہ رہے تھے : ستیاناس کر ڈالا ہے کھیل کا۔ حکیم صاحب بالآخر سین سے باہر آئے تو گھیر لیا انھیں کہ یہ کیا حرکت تھی۔ انھوں نے نہایت بے فکری سے صرف اتنا جواب دیا گانا میری تفریح کے لیے گایا جارہا تھا، جب تک مجھے تفریح کی ضرورت محسوس ہوئی میں گانا گواتا رہا۔

حکیم صاحب کے مقابل حسنہ کا پارٹ میں نے کیا، عباسی کا رفیع پیر نے اور فضیحتا کا دیوان شرر نے۔ ایک تو ہر پارٹ میں کچھ کرنے کے امکانات زیادہ، دوسرے کاسٹ اچھی ہونے کی وجہ سے ہر ایک نے کام جان لڑا کر کیا۔ تکلف بر طرف حسنہ کا پارٹ میں نے ایسا کیا کہ باتفاق رائے ساری کلب کا خیال تھا کہ کالج میں اس وقت تک اس سے اچھا فیمیل پارٹ کبھی نہیں ہوا۔ رفیع پیر نے عباسی کی موت کے سین میں تماشائیوں کو محو حیرت کر دیا۔ دیوان شرر تو فضیحتا کے پارٹ میں ایسے کھیل کھیلے کہ شیخ نور الٰہی، جو ان کے مقابل فیروز کا پارٹ کر رہے تھے، ہنسی سے بیتاب ہو کر اندر ونگ میں بھاگ گئے۔ ہال میں ایک ہلڑ مچ گیا، مگر شیخ صاحب کی ہنسی کسی طرح تھمنے کا نام نہ لیتی تھی کہ واپس سٹیج پر جائیں۔ بہت ضبط کر کے اور سنبھل کر سٹیج کا رخ کرتے مگر شرر کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بے اختیار ہو کر ہنستے اور لوٹ آتے۔ اس پارٹ میں دیوان شرر نے فی البدیہہ فقرہ بازی بھی بہت کی۔ ایک جگہ وہ سادھو بن کر آتے اور اپنے کمالات رضیہ کی ایک سہیلی سے بیان کرتے ہیں کہ ہمارے ہی حکم سے ہوا میں جہاز چلتے ہیں، سوئی کے ناکے سے اونٹ نکلتے ہیں، ہماری بد دعا سے آدمی پس کر میدہ ہو تا ہے، بانجھ عورت کے گھر لڑکا پیدا ہو تا ہے آخری فقرے میں شرر نے وقت کے یوں ترمیم کر دی کہ ہماری بد دعا سے آدمی پس کر میدہ ہو تا ہے، طوطے کے پیٹ سے ککڑ پیدا ہو تا ہے اس زمانے میں کواڈرینگل کے ایک سخت گیر سپرنٹنڈنٹ کو لڑکوں نے ان کی بعض طبعی خصوصیات کی بنا پر طوطے کا خطاب دے رکھا تھا، ان کے جانشین جو نئے سپرنٹنڈنٹ آئے وہ سخت گیری میں دو ہاتھ ان سے بڑھ کر نکلے۔ ان کی بعض طبعی

خصوصیات کی وجہ سے انھیں کگڑ کا خطاب مل چکا تھا، میں آپ سے بیان نہیں کر سکتا کہ طوطے کے پیٹ سے کگڑ پیدا ہونے کے فقرے اور ہنسی اور تالیوں کا غل کتنا اونچا اور کتنی دیر جاری رہا۔ اس قسم کا مقامی پیدا کرنے کا موقع شرر کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

پچھلے سال گورکھ دھندے کے ساتھ میرا مختصر کھیل پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا تھا، اس لیے اس سال کشمکش کے بعد ہیر رانجھا کے تین منتخب سین پنجابی میں پیش کیے گئے۔ ہیر کا پارٹ جسونت نے کیا، رانجھے کا رفیع پیر نے اور سہتی کا شرر نے۔ ہیر رانجھا کی جدائی کا سین بہت موثر تھا۔ مجھے یاد ہے خواجہ حسن نظامی بھی یہ کھیل دیکھنے آئے تھے اور متصوفانہ خیالات سے متاثر ہو کر اتنا روئے تھے کہ ان کی داڑھی بھیگ گئی تھی۔

تو صاحب یہ تھا ہماری جی۔ سی۔ ڈی۔ سی کا پہلا دور جو مجھے دیکھنے کو ملا۔ یہ کلب، طباع، خوش طبع، نفاست پسند اور محفل آرا لوگوں کا ایسا دلچسپ اور دلکش مجمع تھا اور شیخ نور الٰہی کی محبوب شخصیت اسے اس درجہ بارونق اور ولولہ انگیز بنائے رکھتی تھی کہ جو ایک بار کلب میں شامل ہو تا وہ جب تک کالج میں رہتا، بہت مخلصانہ اس کی خدمات سرانجام دیتا اور کالج چھوڑتا تو سب سے زیادہ ڈرامیٹک کلب کی جدائی کو محسوس کرتا۔

جی۔ سی۔ ڈی۔ ؟ کی یہ روش اور اس کی تقریباً تمام پرانی خصوصیات کشمکش کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس زمانے میں مسٹر جی۔ ڈی سوندھی انگلستان سے فارغ التحصیل ہو کر آئے اور بحیثیت پروفیسر اقتصادیات کالج میں ان کا تقرر ہوا۔ سوندھی صاحب کالج کے اولڈ برائے تھے۔ کسی زمانے میں کالج کے کلب میں پارٹ بھی کر چکے تھے۔ ڈرامے سے غیر معمولی شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ انگلستان سے ہو کر آئے تو امیچورز کے کلبوں کے متعلق طرح طرح

کے بہت سے نئے خیالات بھی لائے۔ اُردو تھیٹروں کے مروجہ ڈرامے جو کالج میں
کیے جارہے تھے وہ ان کے خیال میں امیچورز کے لیے غیر موزوں تھے۔ چنانچہ انھیں
انگریزی ڈرامے کی طرف توجہ کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوا۔ کشمکش ختم ہوتے ہی
سب سے پہلے انھوں نے ہملٹ اسٹیج کرنے کا ارادہ کیا۔ کشمکش دیکھنے کے لیے وہ تینوں
رات آئے تھے۔ اپنے ہملٹ کی کاسٹ کے لیے انھوں نے کشمکش کی کاسٹ میں جو لوگ
منتخب کیے تھے، ان میں سے ایک میں بھی تھا۔

لیکن ہملٹ کی تیاری شروع ہوئی تو کالج میں دو جماعتیں بن گئیں؛ ایک
جماعت جو شیخ نور الٰہی سے وابستہ تھی اور چاہتی تھی کہ کلب اپنی پرانی روش پر چلے اور
تھیٹروں کے مروجہ اردو کھیل کرے۔ دوسری جماعت سوندھی صاحب سے وابستہ تھی
اور انگریزی ڈرامے کے حق میں تھی۔ سوندھی صاحب نے کسی مخالفت کا خیال کیے
بغیر ہملٹ کا کاسٹنگ شروع کر دیا۔ مجھے بھی یاد کیا گیا میں سن چکا تھا کہ سوندھی صاحب
نے کشمکش میں میرا پارٹ پسند کیا ہے۔ چنانچہ بزعم خویش یہ سمجھ کر ان کی خدمت
میں پہنچا کہ ہملٹ میں مجھے اوفیلیا کا پارٹ دیا جائے۔ سوندھی صاحب نے کہا گرٹروڈ کا
پارٹ کرنے کو۔ اس سے میری نخوت کو صدمہ پہنچا اور میں پارٹ لینے کے متعلق ہاں
ناں کیے بغیر چلا آیا۔ سوندھی صاحب چند روز میرے آنے کا انتظار کرتے رہے، میں نہ
پہنچا تو کسی دوسرے لڑکے کو گرٹروڈ کا پارٹ دے دیا۔ میں چونکہ اس کھیل میں شامل
نہیں تھا اس لیے اس کے حالات سے زیادہ واقف نہیں۔ ہملٹ کا کھیل میں نے دیکھا
ضرور تھا۔ اس میں ہملٹ کا پارٹ سوندھی صاحب نے آپ کیا تھا اور بڑی خوبی سے کیا
تھا۔ بعض مناظر میں ان کا کام یوں آنکھوں میں موجود ہے جیسے ابھی دیکھا ہو۔ ان کے
مقابل اوفیلیا کا پارٹ جگموہن رام آنجہانی نے کیا تھا۔ کالج میں لڑکوں نے جو زنانہ پارٹ
کیے ہیں ان میں جگموہن کا یہ پارٹ بھی اپنی عظمت اور شستگی کے اعتبار سے ایک یادگار چیز
سمجھیے۔ مسٹر ولنر وائس چانسلر گھوسٹ بنے تھے۔ قدمت اور آواز کے اعتبار سے اس

سے بہتر گھوسٹ کم از کم میرے تصور میں تو نہ آسکتا تھا۔

ہملٹ میں کلاڈیس کا پارٹ کرنے کے بعد شیخ نور الٰہی بہت جلد کالج سے رخصت ہو کر ڈویژنل انسپکٹر مدارس بن گئے۔ ان کی جائے جی۔ سی۔ ڈی۔ سی کی صدارت سوندھی صاحب کو ملی۔ سوندھی صاحب اس زمانے میں بڑی دلکش شخصیت رکھتے تھے۔ خوبرو تو تھے ہی، سپورٹس کی دلچسپی نے جسم کو مناسب حسن بھی بخش رکھا تھا، چال میں سبک پن اور بے تکلفی تھی، جامہ زیب تھے کہ کم میری نظر سے گزرے ہیں، جو کچھ بھی پہنتے ایسا پھب جاتا کہ سبحان اللہ۔ انگلستان سے نئے نئے آئے تو گرے کے مختلف شیڈوں میں سرج اور ٹویڈ کے نمایاں انگریزی تراش کے سوٹ پہنتے، خوش رنگ ٹائیوں کی گرہ بڑے چاؤ سے بندھی ہوتی، کبھی نایاب سے پائپ منہ میں رکھتے، اسکارف کا آنچل بے پروائی سے شانے پر پڑا رہتا، ہیٹ موقع کے مناسب پہنتے، اپنے موٹر سائیکل پر جدھر سے گذرتے لوگ مڑ مڑ کر تکتے رہ جاتے۔ بعد میں رفتہ رفتہ انھوں نے سوٹ پہننا بالکل ترک کر دیا، چوڑی دار پاجامہ، شیروانی اور پگڑی پہننے لگے۔ اس لباس میں بھی پہلے سے کچھ کم چھب نہ نکالی۔ مگر مزاج ذرا خاص ڈھب کا پایا تھا۔ ویسے سب سے ملتے تھے، لیکن گھل مل کر جلدی کسی سے۔۔۔ کھلتے۔ بات کیجیے تو خود بخود احساس ہو جاتا تھا۔ کہ تعلقات کو کن حدود سے آگے نہیں بڑھنا، انھیں جیسے اندیشہ سا رہتا تھا کہ ان کی بے تکلفی کہیں غیر موقع شناس طلبا کو نامناسب تجاوز پر مائل نہ کر دے۔ کوئی طالب علم یہاں حد سے بڑھتا ایسا نشتر سا فقرہ کہتے کہ ہمیشہ کے لیے محتاط ہو جاتا۔ ویسے دل کے بڑے اچھے واقع ہوئے تھے، صاحب مطالعہ بھی تھے، مختلف مسائل پر معقول اور پختہ رائے بھی رکھتے تھے لیکن بے تعلقی کا جو خول انھوں نے اپنے اُوپر چڑھا رکھا تھا، اسے توڑ کر اس کے اندر سے اصلی اور گرمجوش سوندھی کو دریافت کرنا کچھ آسان نہ تھا۔

سوندھی صاحب صدر رہے تو میں سمجھا سیکرٹری مجھے بنائیں گے۔ سیکرٹری اب تک کلب کا سب سے پرانا ایکٹر بنتا رہا تھا۔ کلب میں اب سب سے پرانا میں تھا۔ رسم کے

مطابق سیکرٹری بننے کا حق مجھے پہنچتا تھا لیکن سوندھی صاحب نے ایک ایسے شخص کو سیکرٹری بنادیا جس کا جی۔ سی۔ ڈی۔ سی سے کسی قسم کا کوئی تعلق ہی نہ رہا تھا۔ بعد میں تو میں سوندھی صاحب کے اس فیصلے کا قائل ہو گیا لیکن جب انھوں نے یہ رسم توڑی تھی تو اس وقت مجھے اس میں اپنی صریح حق تلفی نظر آئی تھی۔

ہملٹ کے بعد سوندھی صاحب نے ایک پنجابی ڈرامہ وکٹوریہ کراس پیش کیا۔ یہ ڈراما انھوں نے پیش تو عمدگی سے کیا لیکن ڈرامے میں جان نہ تھی۔ اس لیے اسے غیر معمولی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس کے بعد کلب پر جمود طاری ہو گیا۔ سوندھی صاحب انگریزی ڈرامے کے آسمان سے گرے تو پنجابی ڈرامے کی کھجور میں اٹک چکے تھے۔ وہ پنجابی ڈرامے کے حق میں دو وجہوں سے تھے: ایک تو اس لیے کہ وہ پنجابی ڈرامے کو خود سہولت سے پروڈیوس کر سکتے تھے، دوسرے اس لیے کہ کلب کے اکثر ممبروں کی مادری زبان پنجابی تھی۔ ان کی طباعی کے جوہر اپنی زبان میں زیادہ چمکنے کا امکان تھا۔ پر اس کا کیا علاج تھا کہ جو لوگ پرانی کلب کے تماشوں کا لطف اُٹھا چکے تھے وہ پنجابی ہوتے ہوئے بڑے شد و مد سے اُردو ڈرامے کے حق میں تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس اختلاف رائے کی وجہ سے ایک سال کوئی ڈراما ہی نہ ہو سکا۔ آخر پرنسپل نے موزوں ڈراما منتخب کرنے کو ایک کمیٹی مقرر کر دی۔ اس کمیٹی میں علاوہ چند پروفیسروں کے طلبا میں سے ایک میں رکھا گیا تھا مگر یہ کمیٹی بھی کسی نتیجے پر پہنچنے میں ناکام رہی۔ میں اسٹیج کا جو ڈراما بھی تجویز کرتا۔۔۔ سوندھی صاحب اسے مسترد کر دیتے تھے۔ سوندھی صاحب سے مجھے جو شکوے تھے یوں ان میں اور اضافہ ہوتا رہا۔

اس پر ستم ایک اور بات ہوئی: ان دنوں میں نے سٹیج کے مروجہ ڈراموں کے انداز کا ایک ہنگامہ پسند ڈراما لکھا تھا۔ میرا جی بہت چاہتا تھا کہ میرا۔۔۔ ڈراما جی۔ سی۔ ڈی۔ سی میں اسٹیج ہو جائے۔ راجہ غضنفر علی میری ڈرامہ نویسی کے معترف واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے سوندھی صاحب سے میرے اس ڈرامے کا ذکر کیا۔ سوندھی صاحب

نے ان سے کہا کہ امتیاز سے کہو اپنا ڈراما مجھے لا کر سنائے۔ راجا صاحب نے یہ پیغام مجھے پہنچایا تو میں ڈرامے کا مسودہ لے کر سوندھی صاحب کے ہاں پہنچا۔ یقین تھا سوندھی صاحب نے یہ ڈراما سنا تو داد دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جس خوبی سے ممکن تھا ڈراما پڑھ کر سنایا۔ مجھے یاد ہے جب میں نے ڈرامے کا یہ شعر پڑھا:

گل کھلاتی ہے صبا باغ جہاں میں لیکن

اس کے جھونکے سے مرا غنچہ خاطر نہ کھلا

سوندھی صاحب بڑی بے تکلفی سے فرماتے کیا ہیں کہ مسٹر! اس ڈرامے سے مرا غنچہ خاطر بھی نہیں کھلا۔ اپنے ڈرامے کی یہ داد سن کر میں تو جیسے سناٹے میں رہ گیا۔ چپ ہو کر انتظار کرنے لگا کہ اب یہ خود ہی آگے بڑھنے کی فرمائش کریں گے تو پڑھوں گا لیکن سوندھی صاحب تو جیسے فراغت حاصل کر چکے تھے۔ میرے ڈرامے کو ادھ بیچ میں چھوڑ دوسری باتیں چھیڑ دیں۔ میں دل ہی دل میں جل کر ان کے جواب دیتا رہا۔ پوچھنے لگے: انگریزی کا کوئی نیا ڈراما بھی پڑھا ہے؟ جواب دیا بہتیرے پوچھا۔ کون سے؟ کوئی ڈرامے پڑھے ہوتے تو نام لیتا۔ بعض ڈراما نوسوں کے نام البتہ سن رکھے تھے۔ کہہ دیا یہی برنارڈ شا، گالزوردی وغیرہ پوچھا کیسے لگے؟ کہا۔ کچھ پسند نہیں آئے بولے میرا بھی یہی خیال تھا۔ ذرا دیر کی خاموشی کے بعد کہا برخوردار! انھیں پھر پڑھو۔ میں ان کا یہ مشورہ اس کان سے سن اس کان سے اڑا، دل ہی دل میں جلتا بھنتا، گھر چلا آیا۔ اس کے بعد سوندھی صاحب سے رہے سہے تعلقات بھی منقطع ہو گئے۔ کالج میں آمنا سامنا ہو جاتا تو انھیں سلام کرتا۔ گویا ان سے کوئی قطعی اجنبی طالب علم محض ان کی پروفیسری کی تعظیم کر رہا ہے۔ مجھے اُمید تھی کہ میری بیگانہ روی شاید انھیں متاثر کر سکے گی مگر وہ بھی کچھ عجیب طبیعت کے واقع ہوئے تھے۔ دیکھنے کا تو جیسے نام نہ جانتے تھے۔ جیسا بے تعلق سلام میں کرتا، ویسا بے تعلق جواب وہ دے دیتے۔

کچھ عرصے بعد ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے سوندھی صاحب کے متعلق سارے

شکوے دل سے دھو ڈالے ، گرمیوں کی چھٹیوں سے ایک دو مہینے پہلے سننے میں آیا کہ سوندھی صاحب نے پنجابی کھیل سھدرا اسٹیج کرنے کے لیے اس کی ریہرسل شروع کر دی ہے۔ ریہرسل دو تین ہفتے ہوتی رہی۔ اس کے بعد نہ جانے کیوں اُنھوں نے یہ کھیل اسٹیج کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جو طالب علم اس ڈرامے میں حصہ لے رہے تھے انھیں ڈرامے کے بہانے ہاؤس ایگزامینیشن سے فراغت مل گئی تھی۔ اب انھیں امتحان کا تردد ہوا۔ تین ہفتے سے کتاب اٹھا کر نہ دیکھی تھی، خاطر خواہ تیاری کرنا اب ممکن نہ رہا تھا، جا کر سوندھی صاحب سے کہا ڈرامانہ ہوا تو مارے جائیں گے، جس طرح بھی بنے ڈراما کر ڈالیے۔ انھوں نے فرمایا مجھ سے تو اب ڈراما ہوتا نہیں امتیاز ہمیشہ اُردو ڈراما کرانے پر اصرار کیا کرتا ہے، اس سے جا کر کہو اگر کوئی ڈراما کرنا چاہے تو تم لوگوں کو لے کر کر لے۔

سھدرا کی کاسٹ میں جو لوگ پیش پیش تھے، ان میں ایک صاحب جگل کشور تھے، جو اب احمد سلمان بن چکے ہیں اور ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں۔ یہ مجھ سے آکر ملے اور اصرار کیا کہ کسی طرح جلدی سے کوئی ڈراما اسٹیج کر دو کہ امتحان سے نجات ملے۔ اسی وقت ایک ڈرامہ لکھنے بیٹھ گیا۔ منشی پریم چند کے مختصر افسانے ایمان کا فیصلہ کو مدنظر رکھا اور ہفتے عشرے میں ایک ایکٹ کا ڈراما لکھ مارا۔ ڈراما مکمل ہونے سے پیشتر اس کے پہلے ایکٹ کی ریہرسل شروع کر دی۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں یہ ڈراما کیا تھا۔ اب دیکھوں تو غالباً مطلق پسند نہ آئے لیکن اس زمانے میں کلب کے سب ممبروں نے اور خود میں نے اسے ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھا۔ اس کی تیاری میں کالج کے کسی پروفیسر سے کوئی امداد نہ ملی۔ تمام کا تمام کام ہم ممبر طلبا نے آپ کیا اور حق یہ ہے کہ اپنی بساط سے بڑھ کر کیا۔ گھنٹوں ریہرسل کرتے۔ اُردو ڈرامے کو کامیاب بنانے کے خیال سے ہر ممکن کوشش عمل میں لاتے لکھنے کا وقت شامل کر کے مہینے بھر میں یہ کھیل تیار ہو گیا۔

جس روز ڈراما پیش ہونا تھا اس روز ایک مصیبت یہ پیش آئی کہ کاسٹ میں سے

رشید احمد بیمار پڑ گیا۔ پچھلے دنوں کسی نے بتایا تھا کہ یہ حضرت امپیریل بنک کے مینجر بن چکے ہیں۔ کھیل میں یہ ایک شوخ ملازم کا پارٹ کر رہے تھے۔ چنانچہ رشید سے اصرار کیا گیا کہ جس طرح بھی بنے پارٹ کریں۔ رشید بے چارہ تو آمادہ تھا مگر اس کے والد ڈاکٹر واقع ہوئے تھے۔ ان سے اجازت ملنے کی قطعی کوئی امید نہ ہو سکتی تھی۔ خدا معلوم سب لڑکوں نے مل کر ان کے والد سے کیا کیا جھوٹ بولے۔ بس اتنا یاد ہے شام کو کھیل تھا، تیسرے پہر لڑکے جا کر رشید کو بستر سے اٹھا، کار میں ڈال کر کالج لے آئے۔ یہاں اس کے لیے پلنگ بچھوایا گیا۔ کئی کئی لڑکے اس کی تیمار داری میں مصروف رہے۔ بخار زیادہ تھا، چنانچہ سر پر برف بھی رکھی جاتی رہی۔ بے چارے نے کھیل کے وقت بمشکل اپنا پارٹ کیا۔ لڑکھڑاتا ہوا اسٹیج تک جاتا، فارغ ہو کر پھر کراہتا ہوا چارپائی پر آ کر پڑ رہتا۔ لیکن جتنی دیر بھی اسٹیج پر رہتا ایسی بے تکلفی سے پارٹ کرتا کہ کسی کو گمان تک نہ گزر ا بخار میں بڑبڑا رہا ہے۔ اس کھیل میں ایک پارٹ شیخ ناصر علی نے کیا تھا جو شیخ امتیاز علی مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں اور حال ہی میں ڈپٹی کسٹوڈین بن کر لاہور آئے ہیں۔ یہ ڈراما تو پسند کیا ہی گیا۔ اس میں میرے لیے بہت بڑی بات یہ ہوئی کہ ڈراما دیکھنے کے بعد سوندھی صاحب اندر اسٹیج پر تشریف لائے اور خلاف توقع انھوں نے نہایت گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا اور کھیل کی کامیابی کی مبارک باد دے کر کہا اس کھیل میں بہت زیادہ قابل قدر بات یہ ہے کہ اول سے آخر تک اسے تم لڑکوں نے آپ تیار کیا، امیچورز کے ڈراما پیش کرنے کا یہ پہلو میرے نزدیک بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ کئی لوگ آرٹ کی ایک چیز مل کر پیدا کرتے ہیں۔ سوندھی صاحب کی اس داد سے ساری محنت وصول ہو گئی اور ان کے متعلق دل میں جو شکوے تھے دھل گئے۔

شکوے رفع ہوئے تو ان کی بعض پہلے کی باتوں کی طرف توجہ ہوئی۔ ایک بار انھوں نے جدید انگریزی ڈراما پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ سوچا، پڑھ کر دیکھنا چاہیے۔ چنانچہ اب کی ساری چھٹیاں ڈراما پڑھنے میں گزار دیں۔ ڈراما ہوتا ہی کتنا ہے۔ جو چیز اسٹیج

پر پیش ہو کر دو ڈھائی گھنٹے میں ختم ہو جاتی ہے، اسے پڑھنے کے لیے ایک پورا دن ضرورت سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ میں ساری چھٹیاں ایک ڈرامانی روز کے حساب سے پڑھتا رہا۔ چھٹیاں ختم ہوئیں تو بڑے فخر سے سوندھی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور باتوں میں موقع بے موقع یہ ظاہر کرنے کی سر توڑ کوشش کرتا رہا کہ ڈراما کے متعلق میں بھی ایک اہل الرائے کی حیثیت اختیار کر چکا ہوں۔

اس کلب میں کرنے کے لیے حکیم احمد شجاع کا کھیل بھیشم منتخب کیا گیا۔ غالبا سوندھی صاحب نے کسی موقع پر ان سے ڈرامے کی فرمائش کی تھی۔ ان کا یہ ڈراما تیار تھا، وہ اسے لے کر آگئے۔ اسے سن کر سوندھی صاحب نے اس میں پانچ ایسے سین منتخب کر لیے جنھیں پیش کرنا کلب کے لیے مشکل نہ تھا اور جن کے ذریعے مرکزی کہانی بخوبی ذہن نشین ہو جاتی تھی۔ ڈرامے کی پیشکش میں میں سوندھی کے ساتھ ساتھ تھا۔ بھیشم کے باپ شانتنو مہاراج کا پارٹ مجھے دیا۔ مادھو منتری کا پارٹ مختاری کو ملا۔ دھنیور راج احمد سلمان بنے، گرو دیوان برمھ ناتھ، امبا کا پارٹ جگموہن نے کیا۔ کاسٹ میں اور کون کون لوگ تھے یہ مجھے یاد نہیں۔ اس کھیل میں پہلی مرتبہ پرانی اور نئی کلب کے ممبروں کا میل ہوا۔ ڈراما موثر، کاسٹ اعلیٰ، پیشکش نفیس، بڑا ستھرا کھیل ہوا۔ اس زمانے میں پنڈت تربھوناپرکاش جنھیں مگو کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، کلب کے سیکرٹری تھے۔ مگو جی نے ستیہ وتی کی سہیلیوں کا ناچ اسٹیج پر پیش کرنے میں بڑی محنت اور استقلال سے کام لیا۔ جب تک ہم سب لوگ ریہرسل کرتے یہ سارا سارا وقت سازوں اور ناچ ماسٹر کو لے کر لڑکوں کو ناچ کی تعلیم دلایا کرتے۔ بڑی باریک بینی سے ایک ایک تفصیل پر توجہ کر کے ناچ کے عیوب رفع کراتے۔ ان کی محنت نے ڈرامے کی رونق میں چار چاند لگا دیے۔

سوندھی صاحب کا پارٹ بہت حسین و جمیل تھا۔ انھوں نے اس کی تیاری بڑی محنت اور سوچ سمجھ سے کی تھی۔ ریہرسل کے دنوں ایک روز میں ان کے ہاں گیا تو

برآمدے میں بیٹھے ہندو مجسموں کی تصاویر کی ایک کتاب بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے جرات کر کے پوچھ لیا یہ تصاویر ڈرامے کے لیے دیکھ رہے ہیں؟ اپنی پر اسرار مسکراہٹ کے ساتھ بولے کاکا! ساریاں گلاں نہیں دسی دیاں، مگر کاکا تاڑ گیا کہ وہ مجسموں کے انداز کا مطالعہ کر کے اپنا پارٹ تیار کر رہے ہیں۔ یہاں سے یہ نکتہ ہاتھ آیا تو اٹھ کر سیدھا پبلک لائبریری میں پہنچا۔ وہاں سے اس قسم کی ایک کتاب میں نے بھی نکلوالی۔ دن بھر اس کی تصویروں پر مغزپاشی کرتا رہا کہ اپنے پارٹ میں مجسموں سے مستفید ہونے کا امکان کہاں ہے مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ سوندھی صاحب نے پارٹ کے ایک ایک جزو پر اتنی محنت کی تھی کہ سخت گیر نقاد بھی انھیں داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ تمام پارٹ میں ان کی شخصیت ایک عجیب عظمت کی حامل نظر آتی تھی۔ کنوارا رہنے کا عہد اٹھانے اور اپنی محبوب سے قطع تعلق کرنے کے سین وہ ایسے ارفع ضبط اور محتاط و دل گیر انداز میں پیش کرتے تھے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا تھا۔

بخاری صاحب نے اس کھیل میں کمال کیا۔ انھیں پہلی بار متکلم پارٹ ملا تھا۔ اسے ایسی خوبی سے پیش کیا کہ جھنڈے گاڑ دیے۔ ان کا پارٹ بوڑھے منتری کا تھا جو اپنی سادہ لوحی کی بدولت چھپانے کی ساری باتیں اگل بیٹھتا ہے۔ بخاری صاحب نے اس پارٹ میں ایسے نئے اور انوکھے لہجوں سے کام لیا جن کی طرف بڑے بڑے تجربہ کار ایکٹروں کا خیال بھی نہ جا سکتا تھا۔ خود مصنف کو جملوں کے ان امکانات کا گمان تک نہ گذرا تھا۔ تحریر میں بخاری کی ظرافت کے ذوق کا کون قائل نہیں۔ اس پارٹ میں انھوں نے سب پر اپنے لہجوں کی ظرافت کا سکہ بھی بٹھادیا۔ ان کا کوئی بھی فقرہ ایسا نہ رہا جس پر انھیں تماشائیوں سے فلک شگاف قہقہہ نہ وصول ہوا۔

میرا کام شانتنو مہاراج کا تھا۔ اپنا کام مجھے اپنی جگہ بہت پسند تھا۔ جب بھیشم دربار میں آ کر کنوارا رہنے کی قسم کھاتا اور تخت کے سامنے دوزانو ہو جاتا تھا اس

وقت میں دونوں ہاتھ اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اس کا چہرہ اٹھاتا اور اپنے دردِ عشق کو دبا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا اور اس سے عہد واپس لے لینے کی دردناک التجا کرتا تھا۔ اس موقع پر سوندھی کے مقابل کام کرتے ہوئے ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ خود سوندھی صاحب نے بھی ایک دوبار میرے اس ٹکڑے کی بہت تعریف کی لیکن تماشائی تالیاں پیٹ کر مجھے بہت زیادہ داد اس وقت دیتے جب میں اسٹیج پر پہلی بار آتا تھا۔ ایک روز بخاری نے میک اپ کرتے کرتے مذاقاً کہا یار! تو نے اپنے دوستوں کو یہ سمجھا تو نہیں رکھا کہ اسٹیج پر داخل ہوتے ہی تالیاں پیٹا کریں؟ بات ہوئی تو مذاق میں تھی مگر میں سن کر جل گیا، ضبط کر کے بولا آخر آپ کو اسے میری ایکٹنگ کا کمال سمجھنے میں کیوں تامل ہے؟ بولے ایکٹنگ تو خیر ہے۔ مگر یہ تالیاں سمجھ میں نہیں آئیں۔ میں نے چڑ کر کہا اچھی بات، پھر آج نہیں پٹیں گی، پوچھنے لگے، یہ کیا بات ہوئی؟ میں نے جواب دیا، بس دیکھ لیجیے گا۔

اور واقعی ایسا ہوا؛ اس روز میں اسٹیج پر گیا تو تالیاں نہ پٹیں۔ بخاری صاحب قائل ہو گئے۔ پوچھا۔ بات کیا ہے؟ میں نے کہا بات کیا ہوتی۔ اب کے ہنسی مذاق نے میرا آج کا پارٹ بگاڑ دیا، اصل میں بات یہ تھی کہ میں شکار کھیلتا کھیلتا تیر کمان لیے اسٹیج پر آتا تھا، وہاں لڑکیاں آنکھ مچولی کھیل رہی ہوتی تھیں، ستیہ وتی کی آنکھوں پر پٹی باندھی ہوتی تھی، وہ اپنی کسی سہیلی کے دھوکے میں مجھ سے لپٹ جاتی اور پھر غیر متوقع حس سے بے چین ہو کر آنکھوں کی پٹی کھولتی، مجھے حیرت سے تکتی اور گھبرا کر بھاگ جاتی۔ میں بڑے موڈ میں اسٹیج پر آتا تھا؛ سانس پھولا ہوا، چہرہ تمتمایا ہوا، پیشانی پر پسینہ، توجہ بھاگے ہوئے ہرن کی طرف، لڑکی لپٹ جانے سے گھبرا جاتا اور اس اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا، لیکن جب وہ آنکھوں پر سے پٹی کھولتی اور میری آنکھیں اس سے چار ہوتیں تو میرا جو ہاتھ جہاں ہوتا اسے وہیں چھوڑ کر گنگ سا رہ جاتا اور جب سراسیمہ ہو کر وہ بھاگتی تو اس کے پیچھے چند قدم یوں اٹھاتا جیسے لوہا مقناطیس کے پیچھے کھنچا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ میرے

اسٹیج پر داخل ہوتے ہی عمل میں آتا اور مجبور ہو جاتے۔ جس روز بخاری صاحب نے فقرہ کسا، میں نے تفصیلات کی طرف توجہ نہ کی، نتیجہ یہ ہوا کہ تالیاں نہ پٹیں۔

دھنیو راج کا پارٹ احمد سلمان نے کیا۔ یہ کائیاں قسم کے باپ خوب بنے تھے، اخلاق اور تواضع سے بچھ جاتے مگر اس کے ساتھ اپنی ہٹ سے باز نہ آتے اور عجز کے ساتھ نہ پسیجنے کا انداز خوب اختیار کرتے تھے۔ گرد کا پارٹ دیوان پرسی ناتھ نے کیا تھا۔ لہجہ واضح اور اچھا، آواز اونچی، پارٹ کو تو اور دل نشین طور پر کر گئے۔ بھیشم کی محبوبہ امبا کا پارٹ جمو ہن کو ملا تھا۔ ان کے پارٹ کا صرف ایک ہی سین تھا جس میں بھیشم کنوارا رہنے کا عہد اٹھا کر امبا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہونے کو آتا ہے۔ ہملٹ میں ان دونوں نے ایک دوسرے کے بالمقابل اسی نوع کا کام کیا تھا۔ مگر وہ بیگانی زبان کا کھیل، یہ ہندوستانی کھیل۔ جو اثر اس کھیل میں ایک عام تماشائی پر ہوا ہملٹ میں کیونکر پڑ سکتا تھا۔ یہ سین سارے کھیل کی جان تھا۔ جمو ہن امبا کی فریفتگی، حیرت، بد گمانی اور شدت مایوسی کا اظہار ایسی بے بسی اور بے اختیاری میں توڑ ڈالتے تھے کہ دیکھنے والا سناٹے میں رہ جاتا تھا۔

اس کھیل میں کاسٹ نے تو اپنی بساط سے بڑھ کر کام کیا ہی، اس کی ایک نمایاں خصوصیت اور بھی تھی؛ اس کھیل میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ پروڈکشن بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں کلب کے جن پہلے کھیلوں میں حصہ لیا تھا، ان میں ایکٹر ہر طرح مکمل طور پر آزاد ہوتے تھے۔ ریہرسل میں ان کا تلفظ اور لہجہ صحیح کر دیا جاتا، کہیں کہیں حرکات و سکنات اور چہرے کی کیفیات کے متعلق ہدایات دے دی جاتیں، سٹیج پر ان کی آمد و رفت اور قیام کا ایک سرسری ساخاکہ بن جاتا۔ اس کے بعد انھیں پوری آزادی ہوتی کہ من مانی کر گزریں۔ اس کھیل میں یہ بات نہ تھی۔ سوندھی صاحب نے کھیل کا غائر مطالعہ کر کے ایک مناسب تاثر پیدا کرنے کی غرض سے ہر چیز کو منظم و حفظ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسٹیج پر ایکٹروں کی ہر حرکت خود ان کی سوچی سمجھی ہوئی اور بامعنی

تھی۔ اسے کسی خاص خیال کے مطابق جائز قرار دیا گیا تھا۔ ایکٹروں کے جسم کے انداز، چہرے کی کیفیات، آواز کا ہر اُونچ نیچ ایک خاص مقصد سے ہوتا تھا۔ یوں کہیے کہ ہر ایکٹر ڈائریکٹر کے ایک مکمل تخلیقی تصور کے ماتحت ہو گیا تھا۔ اسے اپنا جو بھی کمال دکھانا تھا، اس ماتحتی میں اور ڈائریکٹر کی رہنمائی میں دکھانا تھا۔ پھر سیٹنگ میں بھی ان کا یہی نقطہ نظر کام کر رہا تھا، مختلف مناظر میں روشنی اور رنگنی کی چند ایسی تزائینی اشیا سے کام لیا گیا تھا جو منتخب تھیں اور ڈائریکٹر کے تخلیقی تصور کو واضح و دل نشیں کرنے میں امداد پہنچاتی تھیں۔

اس زمانے کا ذکر ہے کہ لا کالج میں ایک بنگالی صاحب پرنسپل ہو کر آئے۔ نام کیسر دہ چندر چیٹر جی تھا۔ انھیں ڈرامہ لکھنے کا بہت شوق تھا۔ اتفاق کی بات ادھر یہ پرنسپل بنے اُدھر حکیم احمد شجاع کو ایل۔ ایل بی کا امتحان پاس کرنے کی سوجھی، لا کالج میں داخل ہو گئے، چیٹر جی کو ایسا شاگرد ملا تو اپنے بعض بنگالی ڈرامے حکیم صاحب کو انگریزی میں سمجھا سمجھا کر اُردو میں لکھوانے لگے۔ ڈرامے تیار ہو گئے تو انھیں اسٹیج کرنے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ لا کالج نے مینا سٹیج کرنا طے کیا تو پرنسپل گورنمنٹ کالج کو خط لکھ کر میرے اور بخاری صاحب کے کھیل میں پارٹ کرنے کی اجازت مانگی۔ پرنسپل گورنمنٹ کالج نے اجازت دے دی۔ میں نے اس کھیل میں مینا کا اور بخاری صاحب نے مینا کے شوہر کا پارٹ کیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس کھیل کے بعد کئی پروفیسر، عبدالرحمان چغتائی صاحب کو ساتھ لے کر میرے مینا کے پارٹ کی داد دینے کے لیے میرے ہاں آئے تھے۔ سوندھی صاحب بھی یہ کھیل دیکھنے آئے۔ میرے پارٹ کی تعریف کر کے کہنے لگے۔ بر خودار! امیجینیشن تیرا بہت اچھا ہے۔ پر یہ زنانہ پارٹ کرنے اب چھوڑ دے یہ نہ انھوں نے بتایا کہ کیوں نہ میں ان سے اس کے متعلق پوچھنے کی ضرورت سمجھی۔ ان کی بات گرہ میں باندھی اور پھر کبھی زنانہ پارٹ نہ کیا۔

نہ جانے اس کھیل کی بات ہے یا کسی دوسرے کھیل کی، پرامپٹنگ کا ایک لطیفہ

یاد آگیا ہے وہ بھی سن لیجیے۔ شہباز جو اب کرنل بن چکے ہیں، کھیل میں پرامپٹ کر
رہے تھے۔ میں اسٹیج پر پارٹ کرتے کرتے اپنی ایک سطر بھول گیا۔ کان، پرامپٹر کی آواز
پر لگائے تو سنائی دیا والد نے یہ نہیں کہا تھا والد کا ذکر سارے کھیل میں کہیں نہ تھا، میں
دل میں حیران کہ الٰہی یہ والد کا حوالہ کہاں سے آگیا، میں نے یہ فقرا چھوڑ بری بھلی طرح
جیسے بن پڑا اپنی سطریں ادا کیں۔ سین ختم ہوا تو آکر شہباز صاحب سے پوچھا یہ آپ کیا
پرامپٹ کر رہے تھے کہ والد نے یہ نہیں کہا تھا۔ والد کا ذکر تو سارے کھیل میں نہیں،
وہ کہنے لگے ہے کیسے نہیں، دیکھیے، اسکرپٹ کھول کر دیکھا گیا تو وہاں فقرہ نکلا آپ نے
یہ نہیں کہا تھا۔ جناب شہباز نے جلدی میں آپ کو باپ پڑھا اور پھر ستم یہ کیا کہ دل ہی
دل میں باپ کا ترجمہ والد بھی کر ڈالا۔ فقرہ پڑھ کر نظریں اسکرپٹ پر سے اُٹھا مجھ پر
جمادیں اور اپنی ایجاد پرامپٹ کرتے رہے کہ والد نے یہ نہیں کہا تھا!

لا کالج کے پرنسپل کا ایک کھیل سنتوش تھا۔ اگلے سال سوندھی صاحب نے
اس کھیل کو کاٹ چھانٹ سے مختصر کر کے جی۔ سی۔ ڈی۔ سی میں پیش کیا۔ کھیل میں
قوت نہ تھی مگر سوندھی صاحب کی پیش کش بہت اچھی تھی۔ یہ پہلا کھیل تھا جس میں
اسٹیج حقیقت پسندانہ انداز میں خوبی سے سجائی گئی۔ میں نے اس کھیل میں پارٹ نہ کیا تھا۔
بی۔ اے کرنے اور کچھ عرصہ ایم۔ اے میں پڑھنے کے بعد میں نے کالج چھوڑ دیا تھا۔
کلب میں البتہ برابر آجاتا تھا۔ اس کھیل میں سوندھی صاحب، بخاری صاحب، جمو بن
وغیرہ نے کام کیا۔ کاسٹ میں ایک نئے صاحب بھی اسٹیج پر آئے۔ یہ پی۔ سی چودھری
تھے، بعد میں آئی۔ سی۔ ایس ہو کر آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل بنے۔ ان صاحب
نے ہیروئن کی ایک بہن کا پارٹ اس لوچ سے کیا کہ دیکھنے والے پھڑک اُٹھے۔ لجا کر اور
دائیں ہاتھ کی چھوٹی اُنگلی کا ناخن دانت سے چبا چبا کر الھڑ لڑکی کے پارٹ میں کمال کر دیا
تھا، بنگالی تھے اس لیے آواز زیادہ صاف نہ تھی۔ ایک موقع پر پریشانی کے عالم میں کہتے
تھے، باہر برات آچکی اور ادھر شرلات کسی طرح نہیں مانتی، میں کروں تو کیا کروں۔

پی۔ سی کی یاد میں ہم مدتوں کروں کو کروں کہتے رہے۔

اس کھیل کے ساتھ ایک اور مختصر بنگالی ڈراما، مہارانی آف اراکان انگریزی سے ترجمہ کر کے پیش کیا گیا۔ مجھے مطلق یاد نہیں کہ یہ کھیل کس نے اُردو میں ترجمہ کیا تھا اور اس کی کاسٹ میں کون کون تھا۔ صرف اتنا یاد ہے کہ ایک تو اس میں مسٹر لہری نے پارٹ کیا تھا۔ یہ حضرت بڑے خوش باش بنگالی تھے۔ بہت زیادہ بولنے اور بہت اُونچا بولنے میں شہرت رکھتے تھے۔ ان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ ہر صبح بریک فاسٹ پر ایک عدد میدانی کوے کا روسٹ نوش فرماتے ہیں۔ دوسرے یہ یاد ہے کہ اراکان کا سماں پیدا کرنے کے لیے سوندھی صاحب نے سٹیج کو کیلے کے پتوں سے خوب سجایا تھا۔

پچھلے سال "بھیشم" اتنا مقبول ہوا تھا کہ اگلے سال پھر کالج کی اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ پہلے اور اس سال کے کھیل میں فرق اتنا تھا کہ ایک تو کھیل بہت زیادہ منجھ گیا اور دوسرے امبا کا پارٹ رام پرشاد نے کیا تھا۔ جگموہن کالج سے رخصت ہو چکے تھے۔ امبا کا پارٹ رام پرشاد سے مناسب طریق پر کروانے میں سوندھی صاحب نے بہت محنت کی۔ اُنھوں نے کسی کھیل کی ریہرسل کبھی اپنے گھر پر نہ کی تھی مگر مجھے یاد ہے جس روز رات کو کھیل تھا، میں صبح کو سوندھی صاحب کے ہاں گیا تو دیکھا کہ اپنے آفس کمرے میں رام پرشاد کو ریہرسل کرانے میں منہمک ہیں۔ رام پرشاد سوندھی صاحب کی مرضی کے مطابق پارٹ نہ کر سکنے سے کھسیانا ہو رہا تھا۔ سوندھی صاحب اپنی مرضی کے مطابق نتیجہ حاصل نہ ہونے پر جھنجھلا رہے تھے۔ مجھے اب خیال نہیں پورا فقرہ کیا تھا، جس پر اس وقت توجہ ہو رہی تھی۔ اتنا یاد ہے کہ اس فقرے میں رام پرشاد نے سوندھی صاحب کو مخاطب کر کے آؤ آؤ کہا اور سوندھی صاحب جھنجھلا کر چیں ہو کر اور آنکھیں بند کر کے بولے "میں کوئی کبوتر ہوں جو تم مجھے اس طرح آؤ آؤ کر کے بلا رہے ہو۔" لیکن اسٹیج پر رام پرشاد نے اپنا پارٹ سوندھی صاحب کی مرضی کے مطابق کیا اور انھیں پسند آیا۔

سوندھی صاحب کے والد رائے زادہ بھگت رام صاحب شمالی ہند کے بہت نامور بیرسٹروں میں سے تھے۔ جالندھر میں پریکٹس کرتے تھے، بھیشم دیکھنے لاہور آئے تو کھیل ایسا بھایا کہ ساری کلب کو مہمان بنا کر جالندھر لے گئے۔ ہم سب ٹرین کے ذریعے جالندھر پہنچے۔ رائے صاحب نے اپنے وسیع بنگلے میں ہم سب کو ٹھہرایا، ذاتی طور پر توجہ کر کے سب کی تواضع فرمائی۔ اس رات ہم لوگوں نے جالندھر کے ایک ہال میں بھیشم کیا، بہت داد ملی، لوگوں نے باقی تھیٹروں کے کھیل سے زیادہ ہمارے کھیل کو سراہا اور قہقہے لگاتے اور کھیل کے کورس گانے گاتے آئے۔

اب تک جو کچھ ہوا اسے میں کلب کا عبوری دور سمجھتا ہوں، اس کے بعد کلب بالکل ہی جدید بن گئی۔ اس آخری دور کے تذکرے سے پیشتر کلب کی بعض دوسری متفرق باتوں کا ذکر کر دینا شاید نامناسب نہ ہو۔ کلب اپنے ایکٹروں اور تماشائیوں کے ذوق کی رہنمائی میں قابل قدر خدمت سرانجام دے رہی تھی لیکن اب وہ پرائی رونقیں اور گہما گہمی اس میں نہ رہی تھیں، نہ جمگھٹے لگتے تھا، نہ محفل آرائیاں ہوتی تھیں، نہ فقرے بازیاں، کلب کا کینڈا ہی بدل گیا تھا۔ سوندھی صاحب خاص خاص لوگوں سے ہنسے بولتے ضرور تھے مگر ذرا بے صبر واقع ہوئے تھے، جو کچھ چاہتے، ایکٹر جلد نہ کر پاتے تو جھنجھلا اٹھتے۔ کوڑھ مغزوں پر فقرے بھی کس جاتے لیکن زیادہ تر اپنے کام سے کام رکھتے۔ ریہرسل کی فضا کم وبیش کلاس روم کی سی بن گئی تھی۔ جسے کچھ حاصل کرنے کا شوق ہوتا وہ غور و توجہ سے کام کر کے بہت کچھ سیکھ سکتا تھا۔ ویسے سوندھی صاحب خود یہ بیان نہ کرتے تھے کہ کیا بات کس خیال سے کر رہے ہیں۔ سیکریٹری ایسا شخص مقرر ہونا شروع ہو گیا جو انتظامی قابلیت رکھتا تھا۔ کلب کے طرح طرح کے کاموں میں تگ ودو کر سکتا تھا اور دوسروں سے کام لینا چاہتا تھا۔ کلب کے کسی تجربہ کار ایکٹر کے سیکریٹری بننے کی رسم موقوف ہو گئی تھی۔ پارٹ خوبی سے کرنے پر میڈل ملنے بھی بند ہو گئے تھے۔ اس سے ایک کی حوصلہ افزائی اور بہت سوں کی دل شکنی ہوتی تھی۔ پھر

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب کھیل کے متعلق یہ نقطہ نظر بن گیا کہ وہ ایک تخلیق ہے تو ظاہر ہے اس تخلیق کی کامیابی مجموعہ کوشش کا نتیجہ ہوتی تھی۔ اس میں اعلیٰ ادنیٰ کا فرق یعنی کسی کی خوبی کا اعتراف کرنا اور کسی کو نظر انداز کرنا غیر معقول بات تھی۔ تماشے ختم ہونے کے بعد پکنک پر جانے کا طریق بھی متروک ہو گیا تھا۔ اس کی جائے کالج ہی میں کلب کا ایک پُر تکلف ڈنر ہوتا جس میں مہمان بھی مدعو کیے جاتے تھے۔

شیخ نور الٰہی کی طرح سوندھی صاحب بھی کلب کے ممبروں کے اخلاق و آداب کی درستی کا خیال کبھی نظر انداز نہ کرتے تھے۔ ایک واقعہ تو مجھے اپنا ہی یاد ہے: ایک روز میں سوندھی صاحب کے ہاں انھیں اپنا ایک کھیل سنانے کے لیے گیا۔ اس روز سوندھی صاحب کے پاؤں میں کچھ تکلیف تھی، اٹھ کر آسانی سے چل پھر نہ سکتے تھے۔ اندر ڈرائنگ روم میں ایک آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ باہر مسز سوندھی مجھ سے ملیں اور اندر سوندھی صاحب کے پاس ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ مجھے وہاں چھوڑ کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ میں بیٹھ کر سوندھی صاحب کو ڈراما سنانے لگا۔ میرے ڈراما سنانے کے دوران میں مسز سوندھی کھڑے کھڑے کسی ضرورت سے ڈرائنگ روم میں دو ایک بار آئیں۔ میں بیٹھا ڈراما پڑھنے میں منہمک تھا، دوسرے مجھے یہ تو معلوم تھا کہ کوئی خاتون کمرے میں آئیں تو تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑا ہونا چاہیے، یہ معلوم نہ تھا کہ اگر کوئی خاتون بار بار آئیں جب بھی ہر مرتبہ ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہونا ضروری ہے۔ سوندھی صاحب نے مجھے اس کا سبق دینا بھی ضروری سمجھا، مجھ سے تو کچھ نہ کہا۔ مسز سوندھی سے مخاطب ہو کر بولے معاف کیجیے گا، پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے میں ہر بار آپ کے آنے پر کھڑا ہونے سے معذور ہوں۔ آداب کے متعلق سوندھی صاحب کا یہ سبق مجھے کبھی نہیں بھولا۔

ایک مرتبہ ڈریمٹک کلب کے ڈنر میں ایک صاحب فرنی کی پیالی ہاتھ میں اُٹھائے چمچہ ہلا ہلا کر پاس بیٹھے ہوئے ایک دوست سے سرگرم گفتگو تھے۔ دور سے سوندھی

صاحب کی نظر ان پر پڑ گئی، وہیں سے للکارا۔ اے مسٹر! یہ ڈھال تلوار ہاتھ میں لے کر کس سے جنگ کرنے کا ارادہ ہے۔ مجھے نہیں اُمید ان صاحب نے کسی ڈنر میں فرنی کی پیالی پھر کبھی میز پر سے اُٹھائی ہو۔

ایک بڑی بات سوندھی صاحب نے یہ کی کہ ہمارے دل میں ہماری اہمیت کا احساس پیدا کر دیا۔ امیچیورز کے معنی ہم اناڑی کے سمجھتے تھے۔ پیشہ ور ہمارے نزدیک ہم سے بڑی بالا ہستی تھے۔ پہلی بار سوندھی صاحب نے ہمیں بتایا کہ مغرب میں ڈراما کی بقا و ترقی کے ضامن امیچیورز ہیں۔ پیشہ ور اس کے سوا کچھ نہیں کرتے کہ پٹی ہوئی لکیروں کو مشاقی سے پیٹا کریں۔ امیچیورز ہی ہیں جو نئی نئی باتیں سوچتے اور نت نئے تجربے کرتے ہیں۔ ان کا جو تجربہ سرمایہ داروں کو پسند آجاتا ہے وہ اسے لے اُڑتے ہیں۔ تکلفات کے ساتھ اور منجھے ہوئے پیشہ وروں کی امداد سے بڑے پیمانے پر کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں ڈراما کو ترقی دینے، اس کے لئے امکانات دریافت کرنے، یوں کہو کہ ڈراما کے جسم میں تازہ خون پہنچانے کے ذمہ دار تمام تر مغرب کے امیچیورز ہی ہیں۔ ایسی باتیں معلوم ہونے سے ہم لوگوں کے حوصلے بڑھے اور ہم اپنے آپ کو ایک چیز سمجھنے لگے۔

شاہد سوندھی صاحب کی ایسی ہی حوصلہ افزائیوں کا نتیجہ تھا کہ مجھے برنارڈ شا کے کھیل آرمس اینڈ دی مین۔ جی۔ سی۔ ڈی۔ سی کے لیے اردو میں ترجمہ کرنے کا حوصلہ پڑ گیا۔ میں بتا چکا ہوں کہ سوندھی صاحب کے توجہ دلانے پر میں نے انگریزی ڈراما کا مطالعہ زور و شور سے شروع کر دیا تھا۔ اس زمانے میں شا، ہمارے چہیتے ڈراما نگار تھے۔ آرمس اینڈ دی مین کے ترجمے کا خیال آیا تو میں نے اس کا ذکر بخاری صاحب سے کیا۔ وہ اس زمانے میں گرمیوں کی چھٹیاں بسر کرنے کے لیے پشاور جانے کو پابہ رکاب تھے۔ کہنے لگے شا کی بات اُردو میں آنی مشکل نظر آتی ہے۔ بخاری پشاور چلے گئے، شا کو ترجمہ کرنے کا خیال میرے دل میں برابر چٹکیاں لیتا رہا، آرمس اینڈ دی مین ہر اعتبار

سے اپنی کلب کے لیے موزوں معلوم ہوتا تھا، پلاٹ دلچسپ، مکالمے لذیذ، کاسٹ موجود، سینگ آسان۔ ایک روز اللہ کا نام لے اس کا ترجمہ شروع کر دیا۔ شروع شروع میں تو ترجمے نے بہت پریشان کیا، فقرہ کا مکمل مفہوم اردو میں ادا کر لیتا تو اس میں تقریر کی روانی نہ رہتی، تقریر کی روانی کا خیال رکھتا تو مفہوم ہاتھ سے نکل جاتا لیکن رفتہ رفتہ ترجمہ پر قادر ہوتا چلا گیا۔ گرمیوں میں ڈھائی ایکٹ کے قریب ترجمہ کر ڈالے۔ چھٹیوں کے بعد بخاری صاحب پشاور سے لاہور آئے تو ترجمہ انھیں دکھایا، وہ سن کر بہت محظوظ ہوئے۔ بہت توجہ سے اس کی اصلاح کرنے کی بیٹھ گئے، باقی ترجمے میں میرے ساتھ شامل ہوئے، چند ہی روز میں ڈراما خاطر خواہ طور پر تیار ہو گیا۔ اسے لے کر ہم سوندھی صاحب کی خدمت میں پہنچے۔

برنارڈ شا کے ترجمے کی اطلاع پا کر سوندھی صاحب حیران رہ گئے۔ ڈراما سنا۔ بہت پسند کیا، ترقی کی جانب یہ کلب کا بہت بڑا اقدم تھا۔ ذوق و شوق سے ڈراما اسٹیج کرنے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ بعض لوگ اس خیال سے کھیل کے مخالف تھے کہ اس میں نہ جذبات کی اپیل ہے نہ گانے ہیں شاید عام طور پر پسند نہ کیا جائے لیکن ان اعتراضوں کو خاطر میں نہ لایا گیا، کھیل کی ریہرسل شروع کر دی گئی، کپتان بلونٹشلی کا پارٹ بخاری صاحب کو ملا، سر جیمس سرانوف کا پارٹ خود سوندھی صاحب نے کیا، میجر پٹکاف کا پارٹ مجھے دیا۔ نکولا کا احمد سلمان کو، عورتوں میں رائنا پی۔ سی۔ چودھری بنے لوکا رشید الدین احمد، جو اب ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں، کیتھرین کا پارٹ مسز شرما نے کیا۔

سوندھی صاحب کو اپنے پروڈکشن کے ارمان نکالنے کو کوئی ٹھکا جا کھیل نہ ملتا تھا۔ برنارڈ شا کا یہ کھیل ہاتھ آیا تو اس پر انھوں نے بے حد محنت کی۔ سینگ سادہ مگر بڑے دلکش خود ڈیزائن کیے، بیک کلاتھ پر آسمان کھڑے خود پینٹ کرتے رہے، کم خرچ بالا نشیں پراپرٹی آپ ڈیزائن کی، ذاتی نگرانی میں ہوائی۔ ہمدے حق ان نئے

تقاضوں کو سنتا، حیران ہوتا مگران کی تعمیل خاطر خواہ طور پر کر جاتا تھا۔ سٹیج کی روشنی کی طرف غیر معمولی توجہ کی گئی، نئے بیٹن بنے، ان میں مختلف قوت اور رنگوں کے بلب لگا لگا کر روشنی کا مطلوبہ اثر پیدا کیا گیا، فزکس لیبارٹری کے طلبا نے روشنی فیڈ کرنے کا اہتمام کر دیا، میک اپ کے لیے جیب کے بعد پہلے روبن سٹائن آتا تھا، اب رحمان آنے لگا تھا، رحمان کو سوندھی صاحب نے خود ہدایات دے کر سب کا میک اپ بڑی خوبی سے کرایا۔ کاسٹ کے زیادہ تر لوگ پرانے اور تجربہ کار تھے۔ نئے لوگ غیر معمولی طور پر ذہین اور شوقین تھے۔ عاری صاحب چاکلیٹ کے ایسے طرح دار سپاہی بنے کہ تماشائیوں میں سے کئی خواتین دل تھام کر رہ گئیں۔ سوندھی صاحب نے ایک بر خود غلط فوجی کا کردار ایسی موزوں حرکات کے ساتھ پیش کیا کہ مزے آگئے۔ اپنے متعلق اب کیا کہوں۔ ایک چغد قسم کے کھوسٹ فوجی کا کردار کر رہا تھا، لوگوں کو کافی محظوظ کر گیا۔ احمد سلمان نے نکولا پارٹ بڑی خوبی سے کیا۔ زنانہ پارٹ کرنے میں پی۔ سی۔ چوھدری باکمال تو تھا ہی، اس کھیل میں اس نے انگریزی کے مطالعے سے اپنے پارٹ کے ایک ایک فقرے کی طرف توجہ کی اور بڑے دھڑلے سے پارٹ کیا۔ رشید الدین احمد ایسی بانکی لوکا بنے کہ کیا کہنے۔ شرما نے کیتھرین کے پارٹ میں جان لڑا دی۔ ایک ایک کام کرنے والا اپنی جگہ نگینے کی طرح جڑا ہوا تھا۔ کھیل اتنا مقبول ہوا کہ تین کی جائے پانچ رات ہوا پھر بھی سب شائقین دیکھ نہ پائے۔

کالج میں کیمسٹری کے پروفیسر مسٹر ڈنیکلف تھے۔ یہ بڑے باکمال ایکٹر تھے۔ لاہور کی جمخانہ کلب کے کھیلوں میں پارٹ کیا کرتے تھے۔ جن دنوں کسی پارٹ کی تیاری کر رہے ہوتے تو گھر سے لیبارٹری جاتے وقت ہر روز نئی چال چلتے نظر آتے۔ جمخانہ کلب کا کھیل جب ہوتا، ہمیں دکھانے لے جاتے تھے۔ انھوں نے آرمس اینڈ دی مین دیکھا تو اپنی جمخانہ کلب کے سب یورپین ایکٹروں کو گھیر لائے۔ کیا کیا تعریف کی ہے ان یورپیوں نے ہمارے کھیل کی۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہا کہ پروڈکشن لندن کے

معیار کی ہے۔ اخباروں میں بڑے بڑے ریویو نکلے۔ ڈرامیٹک کلب کے ڈنر پر سوندھی صاحب نے اس سال لاہور کے کئی اہل الرائے حضرات کو مدعو کیا۔ ڈنر کے بعد انھوں نے اپنی تقریروں میں کھیل پر کھل کر اظہار رائے کیا۔ برنارڈشا کے کھیل کی اُردو پیشکش کو ایک تاریخی واقعہ قرار دیا اور کاسٹ میں ایک ایک کا نام لے کر کام کو سراہا۔

لگے ہاتھوں ایک قصہ اپنی حماقت کا بھی بیان کرتا جاؤں، جن دنوں آرمس اینڈ دی مین کی ریہرسلیں ہو رہی تھیں تو سب مجھ سے کہتے تھے کہ پارٹ تو خوب کر رہا ہے لیکن اسے کیا کیجے کہ تیری آواز اس پارٹ کے لیے موزوں واقع نہیں ہوئی۔ اگر ذرا سی بھاری اور بھری ہوتی تو کمال ہو جاتا۔ تقدیر کی بات، ریہرسل کے دنوں میں نزلے زکام سے میرا گلا بیٹھ گیا۔ ریہرسل میں پھر بھی پہنچا۔ اس روز جو بیٹھے ہوئے گلے کے ساتھ کھنکار کھنکار کر ریہرسل کی تو بار لوگوں نے دل کھول کر داد دی۔ کہنے لگے، دوست! اگر تیرا گلا کھیل کے دنوں بھی یونہی بیٹھ جائے تو یادگار پارٹ کر جائے گا۔ میں نے سوچا نہ جانے اس وقت قسمت یاوری کرے یا نہ کرے، کیوں نہ گلے کے اسی بگاڑ کو کھیل ہونے تک طول دینے کی کوشش کی جائے۔ لیجیے صاحب ہر ممکن کوشش شروع کر دی کہ گلا ٹھیک نہ ہونے پائے۔ سردیوں کا زمانہ تھا، شام کے وقت ریہرسل ہوتی، رات پڑے گھر لوٹتا۔ میں دانستہ کھلے گلے آتا جاتا کہ تکلیف جاری رہے۔ نتیجہ حسبِ توقع نکلا، ریہرسل ختم ہو گئیں اور گلا ٹھیک نہ ہوا، کھیل ہوا، بیٹھے ہوئے گلے سے پارٹ کر کے خوب خوب داد حاصل کی۔ پانچ روز چیختے چلاتے رہے اس کے بعد دو تین روز گھر پر آرام سے لیٹ کر ڈراما کی کسل رفع کی۔ اُس سے بن سنور کر نکلے اپنا گلا ڈاکٹر کو دکھانے اس نے جو تشخیص کی، اس سے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے بولا۔ آپ کی سانس کی نالی میں السر (زخم) ہو گیا ہے جو نیچے کو بڑھ رہا ہے اگر کہیں یہ پھیپھڑوں کو چھو گیا تو دق ہو جائے گی آپ کو گھر آ کر والد ماجد کو یہ قصہ سنایا۔ وہ لے کر ایک سپیشلسٹ کے پاس گئے، اس نے بھی یہی تشخیص کی۔ اس قسم کے امراض کے ایک ماہر امرتسر میں تھے،

وہاں لے کر پہنچے، وہاں اس تشخیص کی تصدیق ہوئی۔ کچھ نہ پوچھیے کیا حالت تھی، فکر کے مارے راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ شدت سے علاج معالجہ شروع کیا، جو چیز بھی مرغوب تھی، ڈاکٹر نے اس سے پرہیز کرنے کو کہا۔ ۔۔۔ نمک بند، مرچ بند، ہر لذیذ چیز بند، یہاں تک کہ بولنا بھی بند، گھر پر رہتا تو یار دوست آجاتے اور بولنا پڑتا، اس لیے صبح ہی صبح کتابیں بغل میں دبا کر گھر سے نکل جاتا، پہلے ہسپتال پہنچتا، وہاں کوکین کے اسپرے سے گلا سن کر کے سانس کی نالی میں بہت اندر دوا لگواتا۔ اس سے فارغ ہو کر لارنس باغ چلا جاتا، وہیں دوپہر کے وقت گھر سے کھانا آجاتا، کھالیتا، سارا دن گھاس پر لیٹ کر، بیٹھ کر، ٹہل کر پڑھتا رہتا۔ دونوں وقت ملتے تو گھر آجاتا۔ یوں ہی ایک دو مہینے درویشوں کی زندگی بسر کرتا رہا۔ زخم پھر بھی مندمل نہ ہوا۔ ڈاکٹر کہنے لگے، آپریشن کی ضرورت معلوم ہوتی ہے اور یہ آپریشن، وی آنا کے سوائے کہیں ہو نہیں سکتا۔ ان دنوں نہ ہوائی سفر عام تھا نہ یوروپین ممالک میں آمد و رفت بے تکلفی سے ہوتی تھی اور پھر آپ جانئیے، جانا بھی تعلیم یا تفریح کی غرض سے نہ تھا، آپریشن کرانے جانا تھا، آپریشن بھی سانس کی نالی کا، فکر و تردد کے مارے گھلا جا رہا تھا۔ خدا غریق رحمت کرے حکیم فقیر محمد صاحب کو سالک صاحب کی زبانی میری تکلیف کا حال سنا تو با اصرار اپنے مطب میں بلایا نبض دیکھ کر لب کشائی کی اجازت عنایت فرمائی۔ بولے اگر میں تم کو تین روز میں تندرست کر دوں تو مجھے کیا دو گے؟ میں نے کہا آپ ہی فرما دیجیے کہنے لگے جس تکلیف کے لیے وی آنا کے سفر کے مشورے ہو رہے ہیں، اگر گھر بیٹھے تین روز میں اس سے نجات مل جائے تو میں معقول معاوضے کا مستحق ہوں گا یا نہ ہوں گا؟ میں نے جواب دیا۔ صاحب! قطعی ہوں گے۔ آپ ارشاد فرمائیے۔ صحت ہونے کی صورت میں جو فیس آپ کہیں حاضر کروں گا۔ بولے سنا ہے ان دنوں تم نے کوئی ڈراما انار کلی لکھا ہے، چوتھے روز وہ اپنے ساتھ لانا اور خود پڑھ کر مجھے سنانا، بس یہی میری فیس ہے۔ قصہ مختصر میں ان کی دوا لے کر آگیا۔ تین روز صبح و شام استعمال کی چوتھے روز

صبح صبح ہسپتال جاکر گلے کا معائنہ کروایا، ڈاکٹر نے حیرانی سے کہا، زخم غائب ہو چکا ہے۔ ارے صاحب اچھل پڑا خوشی کے مارے، انار کلی کا ڈراما لے کر بھاگا حکیم صاحب کے ہاں، کن کن لفظوں میں ان کا شکریہ ادا کیا اور اس روز کس سوز سے انار کلی انھیں پڑھ کر سنایا ہے۔ تو صاحب اس ڈرامیٹک کلب میں پارٹ کے پیچھے اس طرح کے پاپڑ بھی بیلے ہیں۔

اس زمانے میں بنگال میں کہیں سیلاب آیا۔ سیلاب زدہ لوگوں کی امداد کے لیے قرار پایا کہ ایک ڈرامیٹک شو ایسی کی جائے جس میں یونیورسٹی کے مختلف کالج حصہ لیں، ہر کالج اپنا ایک مختصر کھیل تیار کر کے لائے اور یکے بعد دیگرے سب کھیل گورنمنٹ کالج ہال میں پیش کیے جائیں۔ اس موقع کے لیے جی۔ سی۔ ڈی۔ سی کو بھی کوئی مختصر کھیل کرنے کی فکر ہوئی۔ عثاری صاحب نے باکس اور کاکس کی نقل تجویز کی۔ اُنھوں نے مل کر اس کا آزاد ترجمہ کیا۔ یہ کوئی پون گھنٹے کا کھیل ہوگا۔ کردار اس میں صرف تین ہیں۔ ایک باکس ایک کاکس اور ذرا سا کردار مسز پونسر کا۔ کاکس کا کردار میں نے کیا۔ باکس کا عثاری صاحب نے اور مسز پونسر کا پرتھوی ناتھ ہون نے جواب ساؤتھ انڈیا ریلوے میں کسی بڑے عہدے پر ہیں۔ سوندھی صاحب نے یہ کھیل ڈائرکٹ کیا اور اس میں خوب خوب ظرافت کے نکتے پیدا کیے۔ جی۔ سی۔ ڈی۔ سی چونکہ میزبان کی حیثیت رکھتی تھی اس لیے وہی دوسرے کالجوں کے کھیلوں کی ضروریات معلوم کر کے سٹیج پر ان کا بندوبست کر رہی تھی۔ جی۔ سی۔ ڈی۔ سی نے ترتیب قائم کی تھی کہ پہلے کس کالج کا کھیل ہو اور پھر کس کالج کا۔ اپنا کھیل ہم نے سب سے آخر میں رکھا تھا۔ اس پر ایک کالج کی کلب کے لوگ بگڑ گئے۔ کہنے لگے "کھیل آخر میں ہونے سے کھیل کی اہمیت زیادہ معلوم ہوتی ہے، آخری کھیل ہم اپنا رکھیں گے۔" ان کو ناراض ہوتا دیکھ کر جی۔ سی۔ ڈی۔ سی نے ان کا کھیل آخری نمبر پر رکھ تھا۔ اپنا کھیل پہلے نمبر پر رکھ لیا۔ لیجیے صاحب باکس اینڈ کاکس شروع ہوا۔ آپ یقین مانیے، کسی کھیل میں تماشائی

اتنے نہ ہنسے ہوں گے جتنے اس کھیل میں ہنسے۔ پی۔ سی۔ چوہدری نے شمار کر کے بتایا کہ پینتالیس منٹ میں گاؤے واضح قہقہے لگے ہیں۔ یہ کھیل کافی مشکل ہے۔ پینتالیس منٹ تک اسٹیج پر زیادہ وقت ایک یا دو ایکٹروں کا رہنا اور لوگوں کو محظوظ کرنا بڑا ٹیڑھا کام ہے۔ مگر کچھ سوندھی صاحب کی ڈائرکشن، کچھ بخاری صاحب کا اور میرا جوڑ ایسا بیٹھا کہ کالجوں کے اس مقابلے میں کیا، لاہور کے کھیلوں میں باکس اینڈ کاکس، یادگار چیزیں کر رہ گیا۔ اس کے بعد دوسرے کالجوں کے کھیل ہوئے کسی کھیل کا رنگ بھی نہ جم سکا۔ لوگ اُٹھ اُٹھ کر جانے لگے، جب اس کالج کی باری آئی جس نے ضد کر کے اپنا کھیل آخر میں رکھوایا تھا تو ہال نصف سے زیادہ خالی ہو چکا تھا۔ اس پر اس کالج کے لوگ پھر ہمارے پاس آئے، اپنے طرزِ عمل کی معافی چاہ کر درخواست کی کہ ہم اپنا کھیل سب سے آخر میں رکھیں۔

نہ معلوم باکس اینڈ کاکس سے پہلے یا اس کے بعد مگر اسی زمانے میں شیکسپیئر کا ٹویلو تھ نائٹ انگریزی میں پیش کیا گیا۔ میں نے اس میں پارٹ نہ کیا تھا۔ صرف اتنا یاد ہے کہ اس میں ڈیوک کا پارٹ مسٹر کول نے جو اب غالباً ہندوستانی افواج میں بریگیڈئر ہیں۔ میلوولیو کی کا پارٹ بخاری صاحب نے اور رٹولی کا پارٹ پر تھوی ناتھ ہون نے غیر معمولی عمدگی و خوبی سے کیا تھا۔ اس زمانے میں سوندھی صاحب نے تجربے کے طور پر ایک اور مختصر کھیل جی۔ سی۔ ڈی۔ سی میں کیا۔ پیرس کے ایک تھیٹر میں، جو صرف دہشت پیدا کرنے کے کھیل پیش کرتا ہے اُنھوں نے ایک کھیل "لمے میزان نیئمر اں" دیکھا تھا۔ اصل کھیل ان کے پاس تھا نہیں، صرف اس کی کہانی یاد تھی۔ اس میں ایک عورت اپنے گونگے اور بہرے لڑکے کو اندھوں کے ایک محتاج خانے میں داخل کر جاتی ہے، جن کی سماعت کی حس تیز اور دل آنکھوں والوں کے خلاف شکوں سے بھرا ہے۔ اس لڑکے کو دفتر کے کمرے میں تنہا پا کر گھیر لیتے ہیں، گونگا بہرا ہونے کی وجہ سے لڑکا نہ ان کی باتیں سن سکتا نہ ان کے طرح طرح کے شبہوں اور اندیشوں کا جواب دے سکتا ہے، چنانچہ اسے پکڑ کر اپنا جیسا بنانے کے لیے اس کی

آنکھیں نکال ڈالتے ہیں۔ سوندھی صاحب نے اس کھیل کی کہانی مجھے سنائی تو میں نے ان کی ہدایات کے مطابق از سر نو اسے لکھ دیا۔ سوندھی صاحب نے دل لگا کر اسے پروڈیوس کیا۔ اندھوں کا کروپنگ ٹٹول ٹٹول کر ان کا چلنا، دیواروں پر ان کے رینگتے ہوئے سائے ان کے متشکی انداز، بڑبڑاہٹ، آوازیں اور آخر میں غنچ دسی لڑکے کی آنکھیں نکالنا، یہ سب کیفیات بڑے سلیقے سے پیش کی گئیں۔ کھیل تو لوگوں کو زیادہ پسند نہ آیا مگر اس کی پروڈکشن سے سب متاثر ہوئے۔

لوگوں کی فرمائش پر، آرمس اینڈ دی مین، ایک بار پھر پیش کیا گیا۔ اب کے بھی شستگی سے ہوا۔ کاسٹ میں صرف دو تبدیلیاں ہوئیں، پی۔ سی چوہدری کی اور جگہ رائینا کا پارٹ ہریش چندر نے کیا، اور کیتھرین کا پارٹ آئی سی نندا نے کیا۔ نندہ مسز رچرڈس کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ یہ خاتون بھی اس زمانے میں ڈراما کے شدید مریضوں میں شمار ہوتی تھیں، اُنھی کی فرمائش پر نندہ صاحب نے دو طبع زاد پنجابی کھیل "سھدرا اور للی دا ویاہ" حقیقت پسندانہ انداز میں لکھے تھے۔ نندا صاحب بھی ڈراما کے فدائیوں میں سے تھے، کیتھرین کا پارٹ بڑے مزے میں کر گئے۔ پروفیسر زنانہ پارٹ کر رہا تو لڑکوں کے لیے مزید دل چسپی کا باعث ہوتا ہے، اُنھیں خوب داد ملی۔ ہریش نے بھی کالج کی روایات کے مطابق رائنا کا پارٹ ایسا کیا کہ کئی لوگوں کو شبہہ گزرا، وہ لڑکی ہے۔

اس کے بعد ہماری تگڑم کچھ عرصے کو ٹوٹ گئی؛ بخاری کیمبرج چلے گئے، سوندھی صاحب کو اور مجھے بخاری کے بغیر کوئی معرکے کی چیز پیش کرنے کا حوصلہ نہ پڑا۔ غالباً اس زمانے میں نندا صاحب کے پنجابی کھیل جی۔ سی۔ ڈی۔ سی میں سٹیج ہوتے رہے۔ میں نے ان کھیلوں میں کوئی حصہ نہ لیا تھا اس لیے ان کے حالات سے زیادہ واقف نہیں۔ کھیل میں نے دیکھے اور پسند ضرور کیے تھے، اتنا غالباً یاد ہے کہ نندا صاحب کا اپنا پارٹ نمایاں اور پر لطف تھا اور اُنھیں اس کی داد خوب ملی تھی۔

بخاری ابھی کیمبرج میں ہی تھے کہ ایک مرتبہ گرمیوں کی چھٹیوں سے کچھ پہلے سوندھی صاحب نے کھلے میں کوئی کھیل کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ میں نے کبھی مشق کے طور پر سنسکرت کے مشہور ڈراما "رتناولی" کو از سر نو اُردو میں لکھا تھا، اس کا مسودہ سوندھی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اُنھیں اس کا انجام کچھ پسند نہ آیا، آتا بھی کیونکہ، سنسکرت ڈرامے راجوں مہاراجوں کی تفریح طبع کے لیے لکھے جاتے تھے۔ ان کی یہ خصوصیت عام ہے کہ کسی شادی شدہ راجا کو کسی دوسری عورت سے محبت ہوئی، محبت کے مسئلے میں رانی کی موجودگی سے کچھ پیچیدگیاں پیدا ہوئیں اور ان کے رفع ہونے کے بعد دوسری عورت بھی راجا کی بیوی بن گئی۔ اب میں اس میں کیا کر سکتا تھا۔ سنسکرت ڈرامے کا پلاٹ ہی ایسا تھا۔ مگر میرے از سر نو لکھے ہوئے۔۔۔ سوندھی صاحب کو پسند آئے۔ چنانچہ اُنھوں نے اسے اسٹیج کرنے کے لیے پسند کر ہی لیا۔

اس زمانے میں کالج میں اوپن ایئر تھیٹر تو تھا نہیں۔ سوندھی صاحب نے اسے باہر پیش کرنے کے لیے کالج کا پچھلا ٹینس لان پسند کیا، وہاں اسٹیج بھی لگوائی، جمنازیئم کی طرف جو بڑ کا درخت ہے، اس کے تنے کے اردگرد بیٹھنے کو ایک خوش نما چبوترہ بنا دیا گیا، یہ درخت گویا ایکٹنگ کے علاقے کا مرکز بھی تھا۔ اس کے پیچھے اور دونوں طرف قوس کی صورت میں سرسبز جھاڑیوں کی قطار بھی گئی، ان ہی جھاڑیوں میں سے راج بھون اور مردانے کو راستے جاتے ہے، سامنے پھولوں کی کیاریاں اور ہری بھری روشیں تیار کی گئیں، بیٹھنے کے لے جگہ جگہ پتھر کے سادے بنچ رکھ دیے گئے، تھوڑی ہی سی توجہ سے یہ جگہ اچھا خاصا گلزار بن گئی، ذرا ہٹ کر شہیریوں کی امداد سے ڈھلوان بنا کر اس پر کرسیاں رکھی گئیں، سامنے چند بڑی بڑی روشنیاں نیچے زمین پر یوں نصب کی گئیں کہ ایکٹ شروع ہوتا تو ان کا رُخ ایکٹنگ کے علاقے کی طرف رہتا، ایکٹ ختم ہو جاتا تو ان کا رُخ تماشائیوں کی جانب کر دیا جاتا تھا۔

اسی کھیل میں راجا کا پارٹ احمد سلمان اور دسنگ کا میں نے کیا تھا۔ ایک

صاحب ہنس راج تھے، وہ منتری بنے تھے۔ ساگریگا (ہیروئی) کا پارٹ سے ملک نے کیا تھا جو ابھی کچھ عرصہ ہوا پنجاب کے فائنس سکریٹری تھے۔ کھیل کی باقی کاسٹ میرے ذہن سے اُتر گئی ہے۔ یہ کھیل بھی پروڈکشن کی جدت کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔ مجھے یاد ہے مسٹر شوری اپنا کیمرہ لیے دنوں ہمارے پیچھے پھرتے رہے کہ آپ نے جیسے یہ کھیل پیش کیا ہے، بالکل ویسے ہی مجھے اس کا فلم بنالینے دیجیے۔ ان کی یہ تجویز کلب نے منظور نہ کی۔ ان کے ایک دوسرے فلم "لاہور کے مشاغل" کے لیے انھیں چند شاٹ لے لینے دیے۔

آرمس اینڈ دی مین کے بعد لاہور کے تعلیم و ترقی یافتہ طبقے میں جی۔ سی۔ ڈی۔ سی نے بہت وقیع حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ٹی پارٹیوں اور ڈنروں میں ملاقات ہوتی تو اہل علم بہت اشتیاق سے کلب کے ذمہ دار لوگوں سے دریافت کرتے کہ اس سال کیا کھیل ہوگا۔ ان میں ہمیں بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ بخاری انگلستان تھے تو میں انھیں لکھتا رہا کہ یہاں کی لائبریریوں میں جدید ڈراما زیادہ نہیں ہے، کوئی ایسا کھیل جو سہولت اور خوبی سے جی۔ سی۔ ڈی۔ سی میں پیش کرنے کے قابل ہو، وہاں سے منتخب کر کے اپنے ساتھ لائیں۔ ادھر بخاری صاحب بھی اپنی تعلیمی مصروفیتوں میں سے جتنا وقت نکال سکتے اس کا بیشتر حصہ ڈرامے اور اسٹیج ہی کے مطالعے میں صرف کر رہے تھے۔ کیمبرج میں اسی زمانے میں فیسٹیول تھیٹر قائم ہوا تھا۔ اس کی پروڈکشنوں کی تصاویر مجھے برابر بھیجتے رہتے تھے۔ واپس آئے تو ٹرنز کا ایک کھیل دی مین ہو ایٹ دی پویو میک اپنے ساتھ لائے۔ یہ کھیل انھوں نے انگلینڈ میں اسٹیج پر دیکھا تھا۔ اسے جی۔ سی۔ ڈی۔ سی میں پیش کرنے اور اس میں لارڈ ہیور کا پارٹ کرنے کا انھیں بہت اشتیاق تھا۔

لاہور آ کر جب وہ باقاعدہ جم گئے تو ہم دونوں نے مل کر اس کا ترجمہ شروع کر دیا۔ ہم ڈراموں کا ترجمہ بے حد احتیاط سے کرتے تھے۔ ایک ایک جملے کے ترجمے میں

اس بات کا خیال رکھتے کہ اسے ادا کرنے کے جو امکانات انگریزی میں ہیں وہ جنسہ اردو میں منتقل ہو جائیں۔ کئی بار صرف نو کا ترجمہ کرنے میں ہمیں دس پندرہ پندرہ منٹ لگ جاتے۔ اچھی طرح غور کر کے نو کا ترجمہ یہاں نہیں ہے، نہ، ہے یا، اوں ہوں، طے نہ کر سکتے تو اٹھ کر ڈراما ایکٹ کرنا شروع کر دیتے اور دیکھتے کہ کردار کی جو کیفیت چلی آ رہی ہے اس میں نو کا کون سا ترجمہ موزوں ترین معلوم ہوتا ہے۔

کھیل کا ترجمہ تیار ہو گیا تو سوندھی صاحب نے اس کی پروڈکشن بخاری صاحب کے سپرد کر دی۔ خود صرف شغل کے طور پر کبھی کبھار ریہرسل میں آجاتے یا بخاری صاحب ان سے کوئی امداد چاہتے تو وہ پہنچا دیتے۔ بخاری کیمبرج سے پروڈکشن کے کام کے لیے خوب لیس ہو کر آئے تھے۔ کھیل میں پارٹ بھی کر رہے تھے، اسے ڈائرکٹ بھی کر رہے تھے۔ کبھی اسٹیج پر چڑھتے، کبھی اپنی جگہ کسی دوسرے شخص کو کھڑا کر کے خود اسٹیج سے چھلانگ مارتے اور تماشائیوں کی جگہ آبیٹھتے۔ کھیل میں کیریکٹر زیادہ تھے اور بخاری صاحب کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ ان کا گروپنگ آنکھ کو بھلا معلوم ہو، وہ اسٹیج پر ایک خوشگوار توازن قائم رکھیں، ہر وقت اسٹیج ایسی نظر آئے جیسے فریم میں جڑی ہوئی ایک دل کش تصویر آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ سوندھی صاحب ان کی محنت اور باریک بینیوں کو دیکھتے تو بہت خوش ہو کر داد دیتے تھے۔

بخاری صاحب آپ جانیے باغ و بہار آدمی، انھوں نے پروڈکشن سنبھالی تو ریہرسلیں بہت دل چسپ اور بارونق بن گئیں۔ کلب کے کئی ممبروں سے ان کے تعلقات بے تکلفانہ تھے، جن سے نہ تھے وہ بھی ان کے علم و فضل اور ان کی طباعی و ذہانت سے بخوبی واقف تھے۔ کام ہوتا نہ ہوتا، اس خیال سے ریہرسل میں جاتے کہ بخاری صاحب کی باتیں ہی سننے میں آسکیں گی اور واقعی بخاری صاحب کی باتیں علاوہ ہدایات ہونے کے لطیف و لذیذ اس درجہ ہوتیں تھیں کہ محفل آرائی کا سبق سمجھی جا سکتی تھیں۔ لیکن ریہرسل میں ان کی ظرافت ایک تو پروفیسرانہ متانت لیے ہوتی، دوسرے اس

سے کسی کی تذلیل نہ ہوتی تھی۔ ایک بار دو لڑکوں کو سمجھایا کہ آپ کو اسٹیج پر ایک طرف کو اس طور پر کھڑا ہو جانا ہے جس سے ظاہر یہ ہو کہ آپ میں ایک دوسرے کے لیے کشش ہے۔ اس ہدایت پر یہ دونوں بازاری انداز میں بڑی شدت سے بغل گیر ہو جاتے۔ تنگ آکر بخاری صاحب بولے ، کشش ہونے سے آپ کی دانست میں فریقین کو ایک دوسرے کے جسم پر مربع انچ کتنا دباؤ ڈالنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے؟ بعض اوقات مجھے شبہ ہوتا تھا کہ لڑکے محض بخاری صاحب کا کوئی فقرہ سننے کے اشتیاق میں تھوڑی دیر تک دانستہ ان کی ہدایات پر عمل نہ کرتے تھے۔

دی مین ہو ایٹ دی پو پو میک میں کئی لوگ اسٹیج پر آئے۔ بخاری صاحب کی محنت و توجہ نے ان سب کو خوب رواں کر دیا۔ مجھے مردانہ پارٹ کرنے والوں میں اپنے اور بخاری صاحب کے علاوہ صرف رشید الدین احمد اور کیدار شرما یاد ہیں۔ زنانہ پارٹوں میں ہیروئن کا پارٹ یدھشٹر راج نے کیا تھا، ایک زنانہ پارٹ بلراج ساہنی نے کیا، بخاری صاحب نے اپنے پارٹ میں استادانہ کمال دکھایا۔ ایک پر اسرار مشرقی پھل، پوپومیک، کھالینے کے بعد لارڈ ہیور کے جسم سے بو آنے لگتی ہے، چہرے کا رنگ نیلا پڑ جاتا ہے، جس سے ایک کی حساس طبیعت اسے سوسائٹی، سے منہ چھپا کر بد افروختہ عزلت میں اچھوت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ان حالات میں اور اپنی منگیتر میوریل سے الگ ہو کر جو کچھ اس پر ذہنی طور سے گزرتا ہے اس کی تفصیلات کے ادا کرنے میں ان کے تخیل نے کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ اب تک ان کے بعض انداز اور لہجے یوں یاد ہیں جیسے کل دیکھے ہوں۔ ان کے مقابل میرا پارٹ تنفس کا تھا۔ پوپومیک کھانے کا طبعی اثر تو سر فائیلو پر ایسا ہی ہوا جیسا لارڈ ہیور پر ہوا تھا لیکن وہ ان باتوں کو خاطر میں نہ لایا، بو سے دوسروں کو محفوظ رکھنے کے لیے غواصوں کا لباس پہن لیا، اس لباس کے ساتھ دو ربڑ کی نلکیاں ہوتی ہیں، ان کا تعلق ایک انجن سے قائم کر دیا کہ سانس لینے کے لیے نلکیوں کے ذریعے تازہ ہوا بہم پہنچاتا رہے۔ آپ جہاں جاتے یہ انجن ساتھ

ساتھ جاتا اور یہ بار بار پمپو! پمپو،، کا غل مچا کر انجن والوں کو تازہ ہوا بہم پہنچاتے رہنے کی طرف متوجہ کیا کرتے۔ جب میں نے یہ پارٹ کیا تو کسی طرح ممکن نہ تھا کہ میں کچہری روڈ سے گزروں اور طالب علموں کے دو چار مجمعوں میں سے پمپو پمپو،، کی آوازیں کان میں نہ پڑیں۔ کیدار شرما نے سر سولومن کا پارٹ کیا تھا۔ ان کا یہ پہلا پارٹ تھا لیکن کیا اس اعتماد اور شستگی سے کہ پختہ کار معلوم ہوتے تھے۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی ان کا ایک فقرہ اب تک کانوں میں گونج رہا ہے ہر مرغی انڈا دینے کے بعد بھی یوں کڑ کڑاتی ہے گویا ایک اسی کا انڈا ہے جو دنیا میں کوئی حقیقت رکھتا ہے۔" یدھشٹر راج بڑی پیاری میوریل بنا تھا۔ شکل صورت تو اچھی پائی ہی تھی، زنانہ انگریزی لباس میں بے تکلف بھی خوب تھا۔ بلراج ساہنی بمبئی کے پیپلز تھیٹر اور کئی فلموں میں آج بہت نام پیدا کر چکے ہیں، اس کے آثار سب کو ان کے اس پہلے پارٹ ہی میں نظر آ گئے تھے۔

یہ کھیل بڑا پر معنی اور اہل نظر کے لیے بڑی اپیل رکھتا تھا۔ اس کے اسٹیج کرنے سے کلب کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ عرصہ تک مختلف لوگ لاہور کے انگریزی اخبارات میں اس پر تبصرہ کرتے رہے۔ اس سال کلب کا ڈنر بھی بہت شاندار ہوا جس میں کلب کی بے مثال خدمات پر کئی نامور حضرات نے بہت کھلے دل سے خراج تحسین پیش کیا۔

جی۔ سی۔ ڈی۔ سی اب لاہور کی سب سے اہم ثقافتی جماعت بن چکی تھی۔ اس کی شہرت صرف یونیورسٹی کی حدود میں نہ تھی، سارے لاہور میں پھیل چکی تھی۔ اس کی یہ شہرت برقرار رکھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ تردد اس بات کا کرنا پڑتا تھا کہ کلب میں پیش کرنے کو اگلا ڈراما بہت اچھا منتخب کریں۔ چنانچہ میں اور بخاری صاحب اپنی فراغت کا بیشتر حصہ ڈرامے پڑھنے اور اس بات پر غور کرنے میں صرف کرتے تھے کہ کس اعلیٰ ڈرامے کو خاطر خواہ طور پر پیش کر لینا اپنے بس کی بات ہے۔ کبھی کوئی ڈراما پڑھ کر غور کرنے کے لیے بخاری صاحب میرے پاس آتے، کبھی

میں ڈراما پڑھ کر بحث کرنے کے لیے ان کے پاس جاتا، کبھی ہم دونوں اپنے پسندیدہ ڈرامے پر سوندھی صاحب کی رائے لینے چلے جاتے۔ یونہی آہستہ آہستہ مہینوں غور ہوتا، تب کہیں جا کر ڈراما اسٹیج کرنے کا قطعی فیصلہ ہوتا۔ دی مین ہو ایٹ دی پوپومیک کے بعد بڑی مشکل پیش آئی۔ جو ڈرامے بھی ہاتھ آسکتے تھے، دیکھ ڈالے، مگر کوئی نظروں میں نہ جچتا تھا۔ ویسے کئی ڈرامے اچھے معلوم ہوتے لیکن نظر ان کی کاسٹ کا بندوبست کرنا اپنے بس کا روگ نہ تھا، یا ان کی پروڈکشن میں جس تکلف و اہتمام کی ضرورت تھی اس سے خاطر خواہ طور پر عہدہ برا ہونا ممکن نظر نہ آتا تھا۔ جہاں کسی مناسب ڈرامے کا سراغ کسی کتاب سے یا کسی کی زبانی ملتا اس کو حاصل کرنے کے لیے ہم دیوانہ وار تگ و دو شروع کر دیتے۔ کئی ڈرامے انگلستان کے پبلشروں کی فہرست کتب دیکھ کر منگوائے اور پڑھے، پھر بھی کسی پر دل نہ ٹھکا۔ آخر بہت عرصے کے غور کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے چیکوسلاویکی مصنف کیرل چیپک کا مشہور ڈرامہ آر یو آر، کلب کے لیے تجویز کیا۔ اس کو پیش کرنے میں کچھ کم مشکلات نہ تھیں لیکن بخاری صاحب ان سے نپٹ لینے کا حوصلہ کر بیٹھے۔ چنانچہ اسے ترجمہ کرنے کو جٹ گئے، وقت مقررہ تک ترجمہ کر ڈالا، ترجمہ ہوا بھی بڑے ٹھاٹھ کا، ہم اپنے کم ترجموں سے اس درجہ مطمئن ہوئے تھے جتنے اس سے ہوئے۔ اس کی پروڈکشن بھی سوندھی صاحب نے بخاری صاحب کے سپرد کر دی۔ سوندھی صاحب اب کلب کے سرپرست رہ گئے تھے، ان کی دعا اور امداد ہمارے ساتھ شامل رہتی تھی۔ کھیلوں میں پارٹ کرنا بھی انھوں نے ترک کر دیا تھا۔ کہتے تھے، اب پارٹ یاد نہیں ہوتا اور پارٹ جب تک پورے طور پر ازبر نہ ہو اور ایک ایک فقرہ بولتے وقت ذہن میں اگلے فقروں کا مبہم احساس موجود نہ ہو، پارٹ کرنے کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس کھیل میں ڈومین کا پارٹ میں نے ادا کیا، ڈاکٹر گال کا کیدار شرما نے، برمن کا رشید الدین احمد نے اور الکوسٹ کا بخاری صاحب نے، ہمینا کا پارٹ ہریش چندر نے کیا، روبوٹوں کے افسر ریڈیس کا پارٹ پروفیسر پریش چندر کھپالیہ نے کیا۔ یہ پہلے کئی

انگریزی ڈراموں میں پارٹ کر چکے تھے۔ اُردو ڈرامے میں ان کا پہلا پارٹ تھا۔ پرائمس کا پارٹ الطاف قادر نے کیا جو اب پاکستانی افواج میں بریگیڈیر ہیں۔ کاسٹ کے باقی لوگوں کے نام مجھے یاد نہیں۔

یہ کھیل سرمایے اور محنت کے مسائل کے متعلق ایک عظیم الشان ڈراما ہے۔ اسے اسٹیج کرنے کا اعلان ہوا تو جہاں ہم لوگوں کی جسارت پر اہل علم حضرات نے حیرت کا اظہار کیا، وہاں ہماری گزشتہ کامیابیوں کا خیال کر کے سب کو یقین بھی تھا کہ ہماری پروڈکشن ادنیٰ ہر گز نہیں ہو سکتی۔ کھیل ہوا تو تماشائیوں میں سے جس کسی نے یہ ڈراما انگریزی میں پڑھ رکھا تھا، اسے اپنی تمام توقعات سے بڑھ کر پایا۔ بخاری صاحب نے پروڈکشن میں کمال کر دکھایا تھا۔ تیسرے اور چوتھے ایکٹ میں تو عجیب سماں بندھ جاتا تھا۔ دینا بھر پر روباٹوں کا قبضہ ہو چکا ہے، صفحہ ہستی پر چند انسان باقی رہ گئے ہیں جو ان روباٹوں کے خالق ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند کر رکھا ہے، عمارت کے چاروں طرف حفاظت کے لیے بہت طاقتور برقی قوت کا تار لگا ہوا ہے، تار کے پرلی طرف روباٹوں کا ایک سیلاب آن پہنچا ہے، ان کے ایک سے چہرے اور ایک لباس ہیں اور ان کی جمی ہوئی سخت نظریں انسان کی اس پناہ گاہ پر پڑ رہی ہیں۔ وہ ان چند انسانوں سے صرف اس شرط پر معاملہ کرنے کو تیار ہیں کہ انھیں بنانے کا فارمولا ان کے حوالے کر دیا جائے لیکن کھیل کی ہیروئن اس فارمولے کو جلا چکی ہے۔ انسان کے لیے روباٹوں کے ہاتھوں اب کہیں پناہ نہیں۔ کمرے میں صرف ایک چراغ روشن ہے۔ اگر روباٹوں نے بجلی گھر پر بھی قبضہ کر لیا تو یہ اکیلا چراغ بجھ جائے گا۔ گھر کے اردگرد حفاظت کے برقی تار ناکارہ ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی انسان کا نشان اس دینا سے مٹ جائے گا۔ چراغ بالآخر بجھ جاتا ہے اور روباٹوں کا سیلاب درانہ کمرے میں گھس آتا ہے، سوائے ایک مزدور کے سب انسان ختم کر ڈالے جاتے ہیں۔

چوتھے ایکٹ میں دنیا کا یہ آخری انسان اپنی باریک تجربہ گاہ کی کھڑکی میں سے

باہر تک کر کہہ رہا ہے کہ انسان باقی نہیں رہا تو دنیا کے گورستان پر سورج کیوں طلوع و غروب ہو رہا ہے۔ روباٹوں کی فرمائش پر یہ انسان اس تحقیق میں مصروف ہے کہ روباٹ مائے کیوں کر جا سکتے ہیں۔ اسے اجازت ہے کہ جس روباٹ کو چاہے توڑ پھوڑ ڈالے، معلوم کرے کہ ان کی ساخت کا فارمولا کیا ہے مگر کچھ اس کے ہاتھ نہیں آتا۔ ادھر دنیا میں روباٹ گھس پس کر ختم ہو رہے ہیں۔ نئے روباٹ بن نہیں رہے، نظام عالم درہم برہم ہونے کو ہے، اندیشہ ہے کہ یہ دنیا ایک ویرانہ بن کر تمام ہو جائے گی کہ یکایک دو روباٹوں میں جن میں ایک مرد اور ایک عورت ہے اور جن میں بمقابلہ دوسروں کے حس زیادہ پائی جاتی ہے، عجیب طرح جنسی کشش آپ سے آپ کروٹ لینا شروع کر دیتی ہے۔ آخری انسان جب اپنے تجربے کے لیے عورت روباٹ کو ختم کرنا چاہتا ہے تو مرد روباٹ اس کے تحفظ کے لیے سینہ سپر ہو جاتا ہے اور جب انسان مرد روباٹ کو توڑ پھوڑنے پر آمادہ ہوتا ہے تو عورت روباٹ اس کے بدلے اپنے آپ کو پیش کر دیتی ہے۔ اس طرح یہ دونوں اس بات کا ثبوت بہم پہنچا دیتے ہیں کہ اس نازک موقع پر قدرت ان دونوں کو مکمل انسان بنا چکی ہے اور اس جوڑے میں یہ صلاحیت پیدا ہو چکی ہے کہ افزائش نسل کر سکیں۔

اس کھیل کو اس زمانے میں جی۔ سی۔ ڈی۔ سی کے عروج کی انتہا سمجھنا چاہیے۔ کھیل نے لاہور کے علمی حلقوں میں اچھا خاصا تہلکہ مچا دیا تھا۔ کبھی کسی کو اس بات کا احساس نہ ہونے پایا تھا کہ ڈرامے کے ذریعے اتنے عظیم مسائل ایسی سلاست اور قوت اور دل نشینی کے ساتھ پیش کیے جا سکے ہیں۔ کاش آپ نے وہ تقریر سنی ہوتی جو اس کھیل کو دیکھ کر سر منوہر لال نے جی۔ سی۔ ڈی۔ سی کے ڈنر میں کی تھی۔ سر منوہر لال اقتصادیات کے عالم تھے۔ ان کا ایک ایک لفظ کلب کی محنت کا گراں قدر معاوضہ تھا۔ کاش آپ نے وہ مضمون پڑھے ہوتے جو اس کھیل کی پروڈکشن پر اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ایک کھیل میں گورنمنٹ کالج ڈرامیٹک

کلب کو بر عظیم ہند کا ایک عدیم المثال ادارہ قرار دیا گیا تھا۔

یہ کھیل غالباً ۱۹۳۳ء میں ہوا تھا۔ جی۔ سی۔ ڈی۔ سی کا یہ آخری کھیل تھا جس میں میں نے حصہ لیا۔ اس کے بعد حالات وواقعات نے یہ پرانی بساط الٹ ڈالی۔ پھر کلب میں کیا ہوا اس کا مجھے ٹھیک علم نہیں۔ جو کچھ میں نے اختصار میں روا روی میں بیان کیا ہے اس میں شاید بعض واقعات کی ترتیب صحیح نہ ہو۔ کئی حضرات کے نام بھی درج ہونے سے رہ گئے۔ میرے سامنے تماشوں کے گروپ فوٹو نہ تھے، ہوتے تو کئی لوگوں کی شکلیں دیکھ کر اور ان کے نام پڑھ کر ان کی یاد آجاتی اور میں ان کا تذکرہ کر سکتا۔ میرا اپنا بھی تذکرہ کچھ زیادہ ہے۔ اس کے یہ معنی ہر گز نہ لیے جائیں کہ میرا مقصود کلب میں اپنی اہمیت کا اظہار ہے، اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی باتیں مجھے زیادہ یاد رہ گئی ہیں۔

اس کے بعد کے واقعات کی دستاویز کوئی دوسرے صاحب تیار کر سکیں گے۔ میری حیثیت اب صرف ایک تماشائی کی رہ گئی ہے۔ وہ بھی ایسے تماشائی کی جسے جی۔ سی۔ ڈی۔ سی مدعو کرلے تو کھیل دیکھنے چلا جاتا ہے۔ مدعو نہ کرے تو دل میں کوئی شکن نہیں رکھتا۔ جو کھیل دیکھ کر کلب کی سرگرمی سے مسرور بھی ہوتا ہے اور پرانی یادوں سے بیتاب ہو کر ملول بھی ہو جاتا ہے۔ کھیل دیکھ چکنے کے بعد بے اختیار جس کا جی چاہتا ہے کہ اس جانے پہچانے ہال سے باہر نہ جائے، یہیں کہیں چھپ رہے اور جب ایک ایک شخص یہاں سے رخصت ہو جائے اور ہال کے دروازوں میں قفل پڑ جائیں تو خاموش، اندھیرے میں ایک بار پھر اپنی پرانی اسٹیج پر چپ چاپ جا بیٹھے۔ یقین سا ہے میں وہاں ہوں گا تو میرے درد اشتیاق کی شدت زمان و مکان کی زنجیریں توڑ کر شیخ نور الٰہی اور سوندھی اور عثاری کو میرے پاس کھینچ لائے گی اور ان کے ساتھ ان سب زندہ دل اور طباع رفیقوں کو، جن کی جوانیاں اسی سٹیج کے تختوں کے محدود طول و عرض میں اپنے اپنے کمال کا مخلصانہ مظاہرہ کر کے رخصت ہو گئیں، رات کے سناٹے میں ہم سب ایک

بار پھر یہاں اکٹھے ہو جائیں اور ہماری دعائیں لامحدود کے بعد سے اپنے محبوب کھیلوں کے نظارے اس اسٹیج پر واپس لے آئیں۔ ہم انھیں مل کر دیکھیں، مل کر ان سے متاثر ہوں اور مل کر ان پر قہقہے لگائیں، ایک دوسرے کو اس کے کام کی داد دیں، اس کام کی داد جس کا دنیا میں اب کوئی ریکارڈ باقی نہیں، جس کی سہانی یاد صرف چند پرانے دلوں میں باقی رہ گئی ہے اور ایک دوسرے کی داد پر تعظیماً جھک جھک کر ایک دوسرے کا شکریہ ادا کریں اور ہال کے سقف بوس دریچوں کے شیشے جب مشرق آسمان کی بے صبری کا پتا دینے لگیں تو سب اٹھ کھڑے ہوں، ایک دوسرے کے گلے ملیں اور بکھر جانے سے پہلے دعا کریں، ان جوانیوں کے لیے جن کے سبک قدم آج اسی اسٹیج کے تختوں پر مصروف عمل ہیں، کہ اے چمن شباب کے رعنا پھولو! جو ہم نہ کر سکے وہ تم کرو، تمھارا کمال ان بلندیوں کو چھونے میں کامیاب ہو جہاں پہنچنے کی ہم سب کو حسرت رہ گئی۔

(انتخاب از راوی)

مآخذ :۔

اردو میں ڈراما نگاری	سید بادشاہ حسین حیدرآبادی	حیدرآباد ۱۹۳۵ء
اردو ڈراما تاریخ و تنقید	عشرت رحمانی	اردو مرکز لاہور ۱۹۵۷ء
فن ڈراما نگاری اور انار کلی	عبدالسلام	مکتبہ ثنا امیہ کراچی ۱۹۶۱ء
آغا حشر اور اُن کے ڈرامے	سید وقار عظیم	اردو مرکز لاہور ۱۹۵۴ء
مباحث	ڈاکٹر سید عبداللہ	مجلس ترقی ادب لاہور
اُردو ڈرامے کا ارتقاء	عشرت رحمانی	شیخ غلام علی ۱۹۶۸ء
حیات اشرف	محمدی بیگم	مطبوعہ دار الاشاعت پنجاب لاہور
مجلس ترقی ادب کی خدمات قومی ترقی کے بیس برس میں	سید امتیاز علی تاج	مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور
حجاب امتیاز علی تاج	انور مرزا	مقالہ برائے ایم۔ اے۔ اردو (پنجاب یونیورسٹی لائبریری)
بیسویں صدی میں اردو کے مزاح نگار	گلزار احمد	مقالہ برائے ایم۔اے۔ اردو (پنجاب یونیورسٹی لائبریری)
اردو میں بچوں کا ادب	شمیم اختر	
اردو میں بچوں کا ادب	اسد اریب	مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ (پنجاب یونیورسٹی لائبریری)

اردو میں بچوں کا ادب	محمود الرحمٰن	کراچی نیشنل پبلشنگ ہاوس ۱۹۷۰ء
اردو میں طنز و مزاح	ڈاکٹر وزیر آغا	جدید ناشرین لاہور۔ ۱۹۶۶ء
اردو ادب میں رومانی تحریک	ڈاکٹر محمد حسن	شیخ بشیر لاہور
سرگزشت	عبدالمجید سالک	قومی کتب خانہ لاہور ۱۹۵۵ء
یاران کہن	عبدالمجید سالک	چٹان۔ لاہور ۱۹۴۸ء
شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی مرحوم	افسر عباس	مقالہ برائے ایم اے اردو (پنجاب یونیورسٹی لائبریری)
اردو میں یکبابی ڈرامے	رشید احمد گریجہ	مقالہ برائے ایم اے اردو (پنجاب یونیورسٹی لائبریری)
اردو ڈرامے کا مطالعہ	اخلاق اثر	ریجنل کالج آف ایجوکیشن بھوپال
اردو میں ڈرامہ نگاری	سید بادشاہ حسین حیدر آبادی ۱۹۳۵ء	شمس المطابع مشین پریس حیدر آباد دکن
اردو ڈرامہ	عبدالسلام خورشید	لاہور
اردو ڈرامہ کا ارتقا	عشرت رحمانی ۱۹۶۸ء	شیخ غلام اینڈ سنز لاہور
اردو ڈرامہ، تاریخ و تنقید	عشرت رحمانی ۱۹۵۷ء	اردو مرکز لاہور
اردو ڈرامہ نگاری	قمر اعظم ہاشمی ۱۹۷۵ء	دی آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ
ڈرامانگاری کا فن	محمد اسلم قریشی (ڈاکٹر) ۱۹۶۴ء	مجلس ترقی اردو لاہور
ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر	محمد اسلم قریشی (ڈاکٹر) ۱۹۷۱ء	مجلس ترقی اردو لاہور

اردو ڈرامے میں نئے رجحانات	محمد اسلم قریشی (ڈاکٹر) ۱۹۸۲ء	ایکوریٹ پرنٹرز، اردو بازار لاہور
مختصر تاریخ ادب اردو	اعجاز حسین (ڈاکٹر)	کراچی، ۱۹۵۶ء

مقالات

ریڈیو ڈرامے کی تاریخ	اخلاق اشر	ندیم۔ بھوپال نومبر ۱۹۷۷ء
ریڈیو ڈرامہ اور اسٹیج ڈرامہ	اخلاق اشر	جامعہ ، نئی دہلی جولائی ۱۹۷۴ء
اردو ڈرامے کے امکانات	انجم اعظمی	افکار، کراچی ڈراما ایڈیشن اپریل مئی ۱۹۸۶ء
اسٹیج ڈرامے کی فنی حیثیت	اے بی اشرف	نئی قدریں، حیدر آباد سندھ ڈراما نمبر ۱۹۸۶ء
حافظ عبداللہ کے ڈرامے	ابراہیم یوسف	سب رس، حیدر آباد (دکن) اکتوبر ۱۹۸۴ء
کچھ ڈراما خورشید کے بارے میں	ابراہیم یوسف	مفاہیم۔ ۱۹۸۰ء ادب نمبر (اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء) گیا
ریڈیو ڈرامہ	اکرم مٹ	سر سیدین "پاکستان ادب" جلد ۴ سر سید کالج راولپنڈی
جدید اردو ڈرامہ اور اس کے مسائل	احتشام حسین	آج کل، ڈراما نمبر ۱۹۵۹ء
ڈرامے کا تدریجی ارتقا	اسرار الحق شیدائی	نیرنگ خیال، لاہور
ڈرامے میں المیے کا تصور	اسلوب احمد انصاری	ادب لطیف، ڈراما نمبر
ریڈیائی ڈراموں کا فنی تجزیہ	اویس احمد	ادب لطیف لاہور جلد ۲۴ ۱۹۴۱ء
اردو ڈراما	اصغر مٹ (مترجم در شہوار)	خیابان، پشاور خاص نمبر ۶۴

عنوان	مصنف	ماخذ
انار کلی کا اکبر اپنے بیٹے سلیم کا رقیب	بشیر بدر	"کتاب" لکھنو، فروری ۱۹۷۰ء
فن ڈراما کل اور آج	بلراج ساہنی	قند مردان، ڈراما نمبر ۱۹۶۱ء
جدید تھیٹر اور ڈراما	جمیل الرحمان بی اے	کاروان ۱۹۳۳ء
ریڈیو ڈرامے کی تاریخ، اخلاق اثر	جیلانی کامران	سب رس، حیدرآباد (دکن) جنوری ۱۹۷۷ء
ریڈیو ڈراما	خاطر غزنوی	خیابان پشاور ۱۹۶۴ء
اردو ڈرامے کا تاریخی ارتقا	درد لکھنوی	آج کل نئی دہلی ستمبر ۱۹۵۳ء
اردو ڈرامے کا تاریخی جائزہ	رحمٰن حمیدی	شاعر بمبئی جلد ۴۳ شمارہ ۱۲_۱۱
اردو ڈرامہ اور اس کا مستقبل	رحمٰن مذنب	ہمایوں لاہور نمبر ۱۹۵۱ء
انار کلی	رحمان مذنب	
انار کلی پر ایک نظر	رمضان علی	شاعر بمبئی شمارہ ۱۱_۱۰ ۱۹۷۶ء
اردو ڈرامہ ۔ روایت اور تجربہ	سید حسن	ہماری زبان نئی دہلی یکم اکتوبر ۷۴
اردو و ادب ۱۸۵۷ تا ۱۹۳۹ء	سید عبداللہ	اردو کراچی جولائی ۱۹۶۸ء
آج کا ڈراما	سجاد ظہیر	شاہراہ دہلی جون ۱۹۶۸ء
اردو ڈرامہ نویسی پر ایک تنقیدی نظر	سید افتخار رسول	یادگار، لاہور ۱۹۳۴ء
اردو یکبابی ڈرامے	سید محمد علی زیدی	شاعر بمبئی اگست ۱۹۶۷ء

ڈراما خورشید کے دو ایڈیشن	سید حسن	ہماری زبان نئی دہلی ۱۵ مارچ ۷۶
ریڈیو ڈراما	سلیم منشی	نئی قدریں، حیدر آباد سندھ ڈرامہ
اُردو ڈرامے کی ابتدا او ارتقا	عبدالعلیم نامی	پگڈنڈی امر تسر دسمبر نمبر ۱۹۶۱ء
اُردو اسٹیج کی نشوونما	عبدالعلیم نامی	قند مردان ڈراما نمبر ۱۹۶۱ء
اُردو ڈرامہ ۱۸۵۷ سے ۱۹۷۵ء تک	عبدالعلیم نامی	اردو ادب علی گڑھ جون ۵۵ء
اُردو ڈرامے کی ایک صدی	عطیہ نشاط	نیا دور، لکھنو اپریل ۱۹۵۴ء
اُردو ڈرامہ پاکستان میں	غلام حسین اظہر (ڈاکٹر)	نیرنگ خیال سالنامہ ۱۹۸۱ء راولپنڈی
کچھ اردو ڈراما کے متعلق	مسیح الزمان	مجلہ تعلیم بھوپال ۷۵، ۱۹۷۴ء
اُردو ڈرامہ آزادی کے بعد	محمد حسن	آج کل ڈرامہ نمبر ۱۹۵۹ء
ڈرامے کا فن اور اُردو اسٹیج	محمد اسلم قریشی	ماہ نو کراچی جنوری ۱۹۶۵ء
بمبئی کا سفر ڈراما خورشید کی بازیافت	تابش حسین نقوی	ماہنامہ آج کل دہلی جنوری ۱۹۷۷ء
اُردو میں مختصر ڈراما	سید حامد حسین	شاعر بمبئی ڈراما نمبر ستمبر ۱۹۶۴ء

رسائل

مخزن۔ اگست ۱۹۱۷ء

مخزن۔ نومبر۔ ۱۹۱۷ء

مخزن۔ دسمبر ۱۹۱۷ء

مخزن۔ مارچ ۱۹۱۸ء

مخزن۔ مئی ۱۹۱۸ء

مخزن۔ مئی ۱۹۲۱ء

مخزن۔ جولائی ۱۹۲۱ء

مخزن۔ اگست ۱۹۲۱ء

مخزن۔ ستمبر ۱۹۲۱ء

مخزن۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء

مخزن۔ جولائی ۱۹۲۷ء

قومی زبان۔ کراچی، نومبر ۱۹۶۵ء

کتاب۔ لاہور، جون ۱۹۷۰ء (تاج نمبر)

دارلفرقان۔ لاہور۔ ۵ فروری ۱۹۶۰ء (سالک نمبر)

ویکلی مصور۔ لاہور۔ یکم مئی ۱۹۷۰ء

نقوش۔ (شخصیات نمبر حصہ دوم) لاہور

ادیب۔ جنوری ۱۹۴۳ء

نوائے ادب۔ بمبئی۔ جنوری ۱۹۶۶ء

صحیفہ۔	لاہور، تاج نمبر اکتوبر ۱۹۷۰ء
صحیفہ۔	لاہور اپریل ۱۹۷۱ء
نئی قدریں۔	حیدر آباد۔ ڈرامہ نمبر جولائی ۱۹۶۱ء
نقوش۔	لاہور۔ (لاہور نمبر)
ساقی۔	دسمبر ۱۹۳۲ء
صحیفہ۔	جنوری ۱۹۷۰ء
ہمایوں۔	فروری ۱۹۳۲ء
آجکل	دہلی۔ ستمبر۔ ۱۹۵۳ء
قند۔	مردان۔ ڈرامہ نمبر۔ ۱۹۶۱ء
ادب لطیف	لاہور۔ جنوری ۱۹۵۴ء (ڈرامہ نمبر)
نیرنگ خیال۔	۱۹۶۹ء سالنامہ۔
آجکل۔	نئی دہلی۔ جولائی۔ ۱۹۷۰ء
ادب لطیف۔	دسمبر ۱۹۵۴ء
ہندوستانی۔	جولائی، ۱۹۳۳ء

☆☆☆☆

پاکستان نے ادب کے میدان میں نابغہ روزگار شخصیات پیدا کی ہیں ان بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں کا ہم پر کم سے کم یہ حق ہے کہ ہم ان کے کارہائے نمایاں آئندہ نسلوں تک بلا کم و کاست پہنچانے کے لیے اقدامات کریں اس مقصد کے پیش نظر ان ادباء پر الگ الگ کتابیں شائع کی جارہی ہیں تاکہ شائقین علم و ادب، محقق اور طالب علم اس ادبی شخصیت کے بارے میں محض ایک ہی کتاب کی ورق گردانی کر کے مطلوبہ معلومات حاصل کر سکیں۔ یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

ISBN:969-472-136-9